محرام الحرام / صفر المظفر — علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ — جولائی 2026

ماہ نامہ

ذوق و شوق

کراچی

نماز جنتری (برائے ماہِ جولائی 2026ء)

پیارے قارئین ! ماہ نامہ ذوق وشوق کے نماز جدول کے ساتھ نماز کا شوق بڑھائیں ۔نماز پڑھیں ،نشان لگائیں اور بڑوں سے دستخط کروا کر اُن کی دُعائیں لیں ۔

تاریخ	دن	فجر	ظہر	عصر	مغرب	عشا	دستخط والدین/سرپرست
1	بدھ						
2	جمعرات						
3	جمعہ						
4	ہفتہ						
5	اتوار						
6	پیر						
7	منگل						
8	بدھ						
9	جمعرات						
10	جمعہ						
11	ہفتہ						
12	اتوار						
13	پیر						
14	منگل						
15	بدھ						
16	جمعرات						
17	جمعہ						
18	ہفتہ						
19	اتوار						
20	پیر						
21	منگل						
22	بدھ						
23	جمعرات						
24	جمعہ						
25	ہفتہ						
26	اتوار						
27	پیر						
28	منگل						
29	بدھ						
30	جمعرات						
31	جمعہ						

پیغامِ الٰہی جل جلالہ

عبداللہ بن مسعود

(مفہوم آیت، از سورۂ توبہ، 38)

”دنیاوی زندگی کا مزہ آخرت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں، مگر بہت تھوڑا۔“

عزیز دوستو! ہم دنیا میں بہت سی چیزوں سے فائدہ اٹھا رہے ہوتے ہیں۔ کئی چیزوں میں ہمیں مزہ آرہا ہوتا ہے۔ کبھی خیال ہوتا ہے کہ اتنے مزے کی چیز ہے، یہ تو پوری اپنے پاس ہی رکھوں گا۔ کبھی دل میں آتا ہے کہ یہ اور بھی مل جائے تو کتنا مزہ آئے، لیکن یہ سب چیزیں ہیں اِس دنیوی زندگی میں۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ گویا ہمیں سمجھا رہے ہیں کہ دیکھو، ایک زندگی اور بھی ہے، وہاں دنیا کی چیزوں سے بھی بڑھ کر نعمتیں ہوں گے، جنھیں دیکھ کر تم دنیا کی ساری لذتیں بھول جاؤ گے، یہاں کے ذائقے وہاں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا کہ دنیا کے سارے مزے اور تمام ذائقے آخرت کے مقابلے میں بالکل غیر معیاری اور حقیر ہیں۔

لہٰذا کبھی دنیا کے کسی مزے کی خاطر اپنی آخرت کو نہ بھولیں، اس لیے کہ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا دنیاوی زندگی کا مزہ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ آخرت کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا مگر بہت تھوڑا۔

اب تھوڑے اور معمولی سے مزے کی خاطر آخرت کے زبردست مزے اور لذت کو بھول جانا تو عقل مندی نہیں۔

پیغامِ نبوی ﷺ

ارشد علی نواب شاہی

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

”جو مسلمان کوئی پودا لگاتا ہے، کھیتی بوتا ہے یا درخت لگاتا ہے اور اُس سے کوئی پرندہ، انسان یا کوئی جانور کھاتا ہے تو وہ پودا لگانے یا کھیتی بونے والے کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔“

(الصحیح لمسلم، 1552)

عزیز ساتھیو! اللہ تعالیٰ نے درختوں اور سبزے کو اِنسانی زندگی کے لیے زندگی بنایا ہے۔ یہ درخت فضائی خاکروب ہیں۔ یہ دن میں زہریلی گیس ”کاربن ڈائی آکسائیڈ“ جذب کرتے ہیں اور ہمیں ”آکسیجن“ مہیا کرتے ہیں۔ درخت سایہ حاصل کرنے کا بھی ذریعہ ہیں۔ درختوں کا زِیادہ ہونا بارش کا بھی ذریعہ ہے۔ ان کی لکڑیاں کام آتی ہیں۔ ان پر لگے پھل انسان استعمال کرتے ہیں۔ یہ درخت، پودے، کھیتی، ہمارے روزگار کا بھی ذریعہ ہیں۔

بس یوں کہہ لیں کہ یہ ہماری زندگی کا حصہ ہیں، لیکن کیا ہم نے اپنی زندگی میں کوئی ایسا پودا لگایا جو درخت بن گیا ہو؟

اگر اِس سوال کا جواب ”نہ“ میں ہے تو براہِ کرم زندگی میں کچھ پودے ضرور لگایئے۔

اگر اِس پیغام کو پڑھ کر ہم میں سے ہر شخص پودا لگائے، اس کی نگرانی کرے، جب تک کہ وہ درخت نہ بن جائے تو ہمارے لیے کتنا بڑا صدقہ جاریہ ہوگا۔ براہِ کرم ایک پودا ضرور خریدیں اور کسی مناسب جگہ پر لگائیں۔

پبلشر محمد عارف رشید نے بچوں کی تعلیمی و تربیتی ترقی و اصلاح کی خاطر ابن حسن پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

جھلکیاں

08 سیرت کہانی (85) — عبدالعزیز
10 بلاعنوان (227) — بنت مسعود احمد
11 منٹو، گلہری اور شیخ چلّی — تابندہ طارق عکس
12 ذوقِ معلومات (125) (کھیل) — سعد علی چھیپا
14 انعام ((حرف کہانی 2 — انعم توصیف
16 ہماری مرضی سے کیسے!؟ (4) — ڈاکٹر عاصم بھروچہ
17 التجا (نظم) — رضوان اللہ عاطر
19 سوال آدھا، جواب آدھا (81) (کھیل) — الطاف حسین مرحوم
21 ساجھے کی ہنڈیا 02 — حافظ سویرا چودھری۔ ملتان
25 چٹ کی آواز — محمد علی ادیب
28 برف (ننھے شوقین کے لیے) — دانیال حسن چغتائی
32 گھومتا مکعب (کھیل) — اسد اشفاق
33 چھوٹی سی تتلی (نظم) — محمد ایوب اختر
34 موٹی ناک — روبینہ عبدالقدیر
36 دوست — احمد عدنان طارق۔ فیصل آباد
38 دو مددگار (پھر کیا ہوا 31) — نذیر انبالوی
41 گھر کا کام (پھول کہانی 02) — ابن الاسلام خاکی
43 میں تو امتی ہوں — سیدہ ناجیہ شعیب احمد

علم کا ذوق، عمل کا شوق بڑھانے والا بچوں کا رسالہ

ماہ نامہ

ذوق و شوق

کراچی

زیرِ سرپرستی:

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

محرام الحرام صفر المظفر ۱۴۴۸ ہجری | جلد: 20

شمارہ: 07

- ناشر ~~~ محمد عارف رشید

مجلس ادارت

- مدیر اعزازی ~~~ عبدالعزیز
- معاون ~~~ محمد طلحہ شاہین
- معاون ~~~ زبیر عبدالرشید

- ڈیزائنر ~~~ اسد اشفاق
- کمپوزر ~~~ سعد علی
- نگران ترسیل ~~~ انس احمد

اس رسالے کی تمام آمدنی تعلیم و تبلیغ اور اصلاح امت کے لیے وقف ہے۔

قیمت 180 روپے

سالانہ ممبرشپ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک
2600/=

ماہ نامہ ذوق وشوق میں اشتہار شائع کرنے کا مطلب تصدیق ہے نہ سفارش۔
یہ صرف عوام کو مطلع کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ مصنوعات کے بارے میں قارئین خود تحقیق فرمالیں۔

خط و کتابت کا پتا

ماہ نامہ ذوق وشوق، پی۔ او۔ بکس: 17984 گلشن اقبال، کراچی۔ پوسٹ کوڈ: 75300
zouqshouq@hotmail.com
ذوق شوق/ zouqshouq

اشتہارات اور سالانہ خریداری کے لیے رابطہ کریں

0300-2229899 - 0309-2228120
دفتری اوقات: صبح 8:00 تا 1:00 دوپہر 2:30 تا 6:00

0319-1181693 JazzCash easypaisa
(نوٹ: جاز کیش / ایزی پیسہ اکاؤنٹ میں رقم جمع کروانے کی رسید اس نمبر (0309-2228120) پر واٹس ایپ کردیں۔)

سالانہ ممبرشپ بذریعہ میزان بینک اکاؤنٹ:

اکاؤنٹ ٹائٹل: Bait ul ilm Charitable Trust (Zouq-o-Shouq)
اکاؤنٹ نمبر: 0179-0103431456، سولجر بازار برانچ، کراچی
(نوٹ: بینک اکاؤنٹ میں رقم جمع کروانے کی رسید اس نمبر (0300-2229899) پر واٹس ایپ کردیں۔)

علیک سلیک

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

عزیز ساتھیو! آیئے، آپ کو ذرا ماضی میں لے چلتے ہیں۔ مدینہ طیبہ کا واقعہ ہے۔ مسلمانوں کو ایک مہم درپیش ہے، اپنا علاقہ چھوڑ کر ایک اور ملک کا سفر کرنا ہے۔ گرمی شدت کی ہے۔ اس کے باوجود سارے ہی مسلمان پُرعزم ہیں۔ گرمی کی سختی اُن کے راستے کی رکاوٹ نہیں بن رہی، البتہ شہر میں کچھ افراد ایسے ضرور ہیں گرمی جن کے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے۔ جی ہاں، دوستو! ایسے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ یہ خود بھی بے ہمت ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی سُستی میں مبتلا کرتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے، اِس موقع پر شہر کے ان افراد نے کیا کہا؟ ان کم ہمت لوگوں نے مسلمانوں سے کہا: لَا تَنفِرُوا فِي الْحَرِّ (تم ایسی تیز گرمی میں گھر سے مت نکلو۔) یعنی آج کے لب ولہجے میں گویا اُنھوں نے یوں کہا: ''ارے بھئی، دیکھ نہیں رہے کہ کتنی گرمی ہو رہی ہے؟ سکون سے ٹھنڈک میں بیٹھے رہو۔ بھئی، ایسی گرمی میں کون گھر سے نکلے گا!''

اس طرح کے تھے ان کے خیالات۔ اب کیا مسلمانوں نے ان کی بات مان لی؟ اور گرمی کو بہانہ بنالیا؟ بالکل نہیں۔ مسلمان کہاں اپنے نبی کی بات سے پیچھے رہنے والے تھے۔ کوئی پیچھے نہیں ہٹا، بل کہ سات مسلمان تو ایسے تھے جن کی سواری کا انتظام نہ ہو سکا تو اُن کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ غم زدہ ہوگئے۔ دُکھ تھا تو اِس بات کا کہ وہ ساتھ روانہ نہیں ہو سکے۔

عزیزو! یہ غزوۂ تبوک کے قصے کی ذرا سی جھلک ہے۔ آپ نے اس واقعے میں غور کیا؟ یہ واقعہ بتا رہا ہے کہ مسلمان باہمت ہوتا ہے، موسم کے اُتار چڑھاؤ سے گھبراتا نہیں ہے، اس کے کام سردی، گرمی سے رکتے نہیں ہیں۔ وہ گرمی، گرمی کا شور نہیں کرتا اور نہ گرمی کی وجہ سے دین کے کسی حکم کو مشکل سمجھتا ہے۔ سخت گرمی میں بھی وہ دینی تعلیمات کے مطابق پورا اور مکمل لباس پہنتا ہے۔ ماحول سے متاثر ہو کر سنتوں کو چھوڑتا نہیں ہے۔ خود بھی حوصلہ مند ہوتا ہے اور آس پاس کے افراد کو بھی حوصلہ دیتا ہے۔

کیا خیال ہے؟ ہم بھی اپنے آپ کو باہمت بنائیں گے نا! یہ گرمی کی شدت تو وقتی ہوتی ہے، یہ ہماری ہمت اور حوصلے کو پست نہ کرے۔ گرمی کو ہوّا نہ بنائیں، سر پر سوار نہ کریں۔ احتیاطی تدابیر اختیار کریں، اللہ تعالیٰ سے دعا کریں اور اپنے کاموں میں لگے رہیں۔ ٹھیک ہے نا! اللہ تعالیٰ ہم سب کو باہمت مسلمان بنائے۔ آمین!

والسلام

پیارے نبی ﷺ

85

عبدالعزیز

دروازہ کھول دیا

اللہ تعالیٰ نے صلح حدیبیہ کو "فتح مبین" فرمایا ہے، اس لیے کہ فتح کے معنی کسی بند چیز کے کھول دینے کے ہیں اور عرب کی مخالفت کی وجہ سے اب تک اسلام کی دعوت اور تبلیغ کا جو دَروازہ بند تھا، اس صلح نے اس دروازے کو کھول دیا۔ اب وہ وقت آ گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام اس کے تمام بندوں تک پہنچایا جائے اور اِسلام کی طرف تمام عالم کو دعوت دی جائے۔

چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ سے واپس آ کر سن چھے ہجری میں دنیا بھر میں اس وقت کے بادشاہوں کے نام اسلام کی دعوت کے خطوط بھیجے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جمع کر کے خطبہ دیا:

"اے لوگو! میں تمام دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، تمام دنیا کو یہ پیام پہنچاؤ، اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے گا۔ دیکھو، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کی طرح اختلاف نہ کرنا کہ اگر قریب بھیجنے کو کہا تو راضی ہو گئے اور اگر کہیں دور جانے کا حکم دیا تو زمین پر بوجھل ہو کر بیٹھ گئے۔"

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین دل و جان سے اللہ کے رسول ﷺ کے اس حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہو گئے۔

قابل اعتماد نہیں سمجھتے:

آپ ﷺ نے بادشاہوں کو دعوتی خطوط بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایک مناسب مشورہ آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا:

"اے اللہ کے رسول! عموماً بادشاہ جس خط پر مہر نہ ہو، اُسے قابل اعتماد نہیں سمجھتے، یہاں تک کہ ایسے خط کو پڑھتے تک نہیں۔"

آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مشورے سے ایک چاندی کی انگوٹھی بنوائی (جسے مہر کے طور پر استعمال کیا جاتا) اس انگوٹھی پر "محمد رسول اللہ" کندہ تھا، سب سے نیچے لفظ "محمد"، سب سے اوپر لفظ "اللہ" تھا اور لفظ "رسول" بیچ میں تھا۔

(زرقانی، ج:3،ص:334)

پھر آپ ﷺ نے بادشاہوں کے نام خطوط روانہ فرمائے، انھیں اسلام کی دعوت دی اور اِس بات سے آگاہ فرمایا کہ رعایا کی گمراہی کی تمام تر ذمے داری تم پر عائد ہوگی۔

کیا تمھیں معلوم ہے:

ایک خط قیصر روم ہرقل کے نام حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ روانہ فرمایا۔ قیصر روم اس وقت فارس کی فتح کے شکرانے میں حمص کے علاقے سے پیدل چل کر بیت المقدس آیا ہوا تھا۔ حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ سن 7 ہجری میں بیت المقدس پہنچے اور بصریٰ کے امیر کے ذریعے سے قیصر روم کے دربار میں پہنچ کر آپ ﷺ کا خط مبارک پیش کیا۔

اللہ کے رسول ﷺ کا خط پیش کرنے سے پہلے حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے ایک مختصر سی تقریر فرمائی:

"اے قیصر روم! جنھوں نے مجھے آپ کی طرف سفیر بنا کر

بھیجا ہے، وہ آپ سے کہیں بہتر ہیں اور جس ذات نے انھیں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، وہ سب سے اعلیٰ اور ارفع ہے، لہٰذا جو کچھ عرض کروں اسے تواضع کے ساتھ سنو اور اِخلاص سے اس کا جواب دو۔ اگر تواضع کے ساتھ نہ سنو گے تو اِسے سمجھ نہ سکو گے اور جواب میں اخلاص نہ ہوگا تو وہ جواب انصاف پر مبنی نہ ہوگا۔''

قیصر روم نے کہا:

''فرمایئے۔''

حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے پوچھا:

''کیا تمھیں معلوم ہے کہ حضرت مسیح بن مریم علیہ السلام نماز پڑھا کرتے تھے؟''

قیصر روم نے کہا:

''ہاں، بے شک! وہ نماز پڑھا کرتے تھے۔''

حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے پھر کہا:

''میں آپ کو اُس ذات پاک کی طرف بلاتا ہوں جس کے لیے مسیح نمازیں پڑھتے اور جس کے سامنے سجدہ کرتے تھے۔ جس نے حضرت مسیح کو ماں کے پیٹ میں بنایا۔ جس نے ان تمام آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا۔ اس کے بعد تمھیں اس نبی امی کی طرف بلاتا ہوں جن کی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے بشارت دی ہے اور تمھیں اس کا مکمل علم اور پوری خبر ہے۔ اگر تم اس دعوت کو قبول کرو تو تمھارے لیے دنیا اور آخرت، دونوں ہیں، ورنہ آخرت تو تمھارے ہاتھ سے جاتی رہے گی اور دُنیا میں دوسرے لوگ تمھارے شریک ہوں گے۔ یقین جانو کہ تمھارا ایک پروردگار ہے جو منکرین کو کچل ڈالتا ہے اور اپنی نعمتوں کو بدلتا رہتا ہے۔''

قیصر روم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط مبارک حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے لے کر سَر اور آنکھوں پر رکھا، اسے چوما، کھول کر اُسے پڑھا اور کہا: ''سوچ کر کل اس کا جواب دوں گا۔''

(روض الانف، ج:2، ص:355)

اسلام لے آؤ، سلامت رہو گے:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خط میں یہ تھا:

''بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ خط ہے محمد اللہ کے بندے اور اُس کے رسول کی طرف سے ہرقل کی جانب، جو روم کا بڑا شخص ہے، سلام ہو اُس پر جو ہدایت کا اتباع کرے۔

امابعد! میں تمھیں دعوت دیتا ہوں اس کلمے کی جو اِسلام کی طرف لانے والا ہے، یعنی کلمہ طیبہ۔ اسلام لے آؤ، سلامت رہو گے اور اللہ تعالیٰ دُہرا اجر عطا فرمائیں گے، جیسا کہ اہل کتاب سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ اگر تم اسلام سے روگردانی کرو گے تو تمام رعایا کے اسلام نہ لانے کا گناہ تم پر ہوگا کہ تمھاری اتباع کرتے ہوئے اسلام کے قبول کرنے سے باز رہے۔ اے اہل کتاب! آؤ، ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان تسلیم شدہ ہے، وہ یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، نہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کریں اور اللہ کے سوا آپس میں ایک دوسرے کو اپنا رَب اور معبود نہ بنائیں۔ اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو آپ کہہ دیجیے کہ تم گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہو چکے ہیں، یعنی اللہ کے حکم کے تابع ہو چکے ہیں۔''

قریبی رشتے دار کون ہے:

قیصرِ روم نے اپنے خادموں کو حکم دیا کہ جو لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قوم کے میرے ملک میں آئے ہوئے ہوں، انھیں حاضر کیا جائے، تاکہ ان سے حالات معلوم کروں۔

ابوسفیان، قریش کے کچھ لوگوں کے ساتھ اس وقت تجارت کے لیے ملک شام آئے ہوئے تھے اور ''غزہ'' میں مقیم تھے۔ ابوسفیان اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ قیصرِ روم کے آدمی انھیں غزہ سے جا کر لائے اور دَربار میں حاضر کیا۔ بڑی شان و شوکت سے دربار منعقد کیا گیا، روم کے بڑے بڑے لوگ اس وقت حاضر تھے۔

قریش کے لوگوں سے پوچھا گیا:

''تم میں سے نبوت کا دعویٰ کرنے والے کا سب سے قریبی رشتے دار کون ہے؟''

ابوسفیان نے کہا:

''میں۔''

قیصر نے کہا:

''تو تم میرے قریب ہو جاؤ۔'' اور باقی قریش کے لوگوں کو اُن کے پیچھے بیٹھنے کا حکم دیا اور کہا:

''میں ان سے کچھ پوچھوں گا، اگر جھوٹ بولیں تو تم انکار کر دینا۔''

ابوسفیان کہتے ہیں:

''اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ میرا اِنکار کریں گے تو میں ضرور جھوٹ بولتا۔''

اس کے بعد گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔

اس قسط سے ہم نے کیا سیکھا

اس قسط میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا کے بادشاہوں کو خطوط لکھنے کی شروعات کرنے، اس کام میں اپنے ساتھیوں کو ساتھ شامل کرنے، ہرقل کو خط لکھنے، خط کے لیے حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو بھیجنے، حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کا ہرقل کو خط پیش کرنے سے پہلے دعوت دینے، ہرقل کا خط کے ساتھ اچھا سلوک کرنے، قیصرِ روم کے خط پڑھ کر قریش کے لوگوں کو دربار میں بلا کر تصدیق کرنے کا تذکرہ ہے، جس سے ہمیں 13 سبق ملتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

1۔ دعوت کے کام میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت (صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین) کو شامل کیا۔

2۔ دعوت کے لیے قدم کے ساتھ قلم بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

3۔ حق بات بھی حکمت، محبت اور دلیل سے پہنچانی چاہیے۔

4۔ دین کا کام بھی سلیقے اور پیشہ وارانہ (Professional) انداز سے ہونا چاہیے۔ دنیا کے اصول جانتے ہوئے کام کیا جائے، تا کہ بات رد نہ ہو۔

5۔ دنیاوی معاملات کا زیادہ علم رکھنے والوں کی بات مان لینے میں ہرج نہیں ہے، بشرطے کہ دین کے کسی اصول سے نہ ٹکرائے۔

6۔ سچ میں ایسی طاقت ہے کہ دشمن کا دِل بھی گواہی دے دیتا ہے۔

7۔ ہر خیر کے کام کو اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرنا چاہیے۔

8۔ خط کی ابتدا بھی بسم اللہ سے ہونی چاہیے۔

9۔ خط بھیجنے والا پہلے اپنا نام لکھے، لیکن یہ ضروری نہیں، اس کے برعکس جسے خط بھیجا جا رہا ہے، اس کا نام بھی پہلے لکھا جا سکتا ہے۔ (یہ بھی دیگر مواقع سے ثابت ہے۔)

10۔ جسے خط لکھا جائے، اس کے لیے اس کے مرتبے کے لحاظ سے مناسب القاب استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

11۔ کافر کو ''السلام علیکم'' نہ کہا جائے، بل کہ کافر کو سلام کا طریقہ یہ ہے کہ اسے ''اَلسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی'' کہا جائے۔

12۔ اہل کتاب (یہودی اور عیسائی) میں سے کوئی اسلام قبول کرے تو اسے دُہرا اَجر ملے گا، ایک اپنے نبی پر ایمان لانے کا اور دُوسرا نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا۔

13۔ اسلام کو قبول کرنے اور اُس پر عمل کرنے ہی میں سلامتی ہے۔

......(جاری ہے)......

بلاعنوان 227

بنت مسعود احمد۔ کراچی

''ہائے!'' اسے اپنے پیچھے سے ایک مانوس سی آواز سنائی دی۔

کیاری میں گوڈی کرتے ہوئے ابوبکر کے ہاتھ پل بھر کے لیے رُک گئے۔

''السلام علیکم!'' اس نے اٹھ کر ''ہائے'' کے جواب میں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔ یہاں اس گھر میں ایک لڑکا رہتا تھا نھا، کیا تم اسے جانتے ہو؟''

''بالکل! بہت اچھی طرح۔ وہی لڑکا نا جسے آپ ''موٹو'' کہہ کر بلاتے تھے؟''

''ہاں، ہاں، وہی! کہاں ہے موٹو، اس کا کچھ اتا پتا؟''

''وہ تو کہیں کھو گیا ہے۔'' ابوبکر سنجیدگی سے بولا۔

''کہاں کھو گیا؟'' احمر کے لہجے میں فکر مندی در آئی۔

''معلوم نہیں۔'' وہ کندھے اچکا کر واپس بیٹھ کر اپنے کام میں مگن ہو گیا، جب کہ احمر بے چین ہو کر اس کے سر پر آ کھڑا ہوا۔

......☆......

یہ دو سال پہلے کی بات ہے، جب احمر اپنے گھر والوں کے ساتھ دادا کے پڑوسی علی انکل (جو اُن کے دور کے رشتے دار بھی تھے) کے

بہترین عنوان تجویز کرنے پر 1000، دوسرا بہترین عنوان تجویز کرنے پر 750، تیسرا بہترین عنوان تجویز کرنے پر 500 روپے انعام دیا جائے گا۔ ''بلاعنوان'' کے کوپن پر عنوان تحریر کر کے ارسال کریں۔

عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 31 جولائی 2026 ہے۔

نوٹ: کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا جس پر اعتراض قابلِ قبول نہ ہوگا۔

یہاں دعوت پر مدعو تھا۔

علی انکل کی تین بیٹیاں تھیں، جو سب احمر سے بڑی تھیں۔ وہ یہاں آکر بہت اُداس ہو رہا تھا۔ علی انکل نے اسے بے زار بیٹھے دیکھ کر کہا:

''بیٹا! آپ ننھے کے کمرے میں جا کر کچھ کھیل لو۔''

''کون ننھا؟'' احمر بڑبڑایا۔ ''عجیب! بھلا وہ ایک ننھے بچے کے ساتھ کیا کھیل سکے گا؟''

''یہ برابر والا کمرا اُسی کا ہے۔'' اُنھوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

وہ ناچار اُٹھ کر کھڑا ہوا اور بند دَروازے پر دستک دی۔ کئی دفعہ دستک دینے پر جب دروازہ نہ کھلا تو اُس نے ہینڈل گھمایا اور آہستگی سے اندر داخل ہو گیا۔

''یہ کمرا ہے یا کباڑ خانہ!؟''

اسے حیرت ہوئی، پورا گھر صاف ستھرا ہے تو یہ کمرا اتنا گندا کیوں ہے؟

سامنے لیپ ٹاپ کھلا پڑا تھا۔ بستر کی چادر سمٹ کر ایک طرف کو لٹکی ہوئی تھی۔ جا بجا چاکلیٹ، چپس اور بسکٹ کے خالی کاغذ بکھرے تھے اور کئی جوس کے خالی ڈبے میز پر دَھرے تھے۔ قالین پر شاید کچھ میٹھا مشروب گرا ہوا تھا، جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

''یہ ننھے میاں کم، گندے میاں زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔'' اس نے خود کلامی کی۔

اگلے ہی لمحے بیت الخلا کا دَروازہ کھلا اور جو 'چیز' اس کے سامنے آئی وہ کہیں سے بھی ''ننھا'' کہلانے کے لائق نہیں تھی۔

''آپ کون؟'' سامنے والا اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں حیرت لیے احمر کو تک رہا تھا۔

''میں احمر ہوں، برابر والے فہد صاحب کا پوتا۔''

''اوہ! انکل فہد کے پوتے ہو۔ یہاں کیا کر رہے ہو؟'' تھل تھل کرتے وجود کے ساتھ دھپ سے بستر پر بیٹھتے ننھے نے سوال کیا۔

''علی انکل نے کہا ہے کہ ننھے کے ساتھ کچھ کھیل لو۔''

''اچھا۔ میں تو بہت تھک چکا ہوں، ابھی تو سوؤں گا۔'' اس نے انگڑائی اور زَبردستی کی جمائی لی۔

''ٹھیک ہے، کوئی بات نہیں، میں چلتا ہوں۔''

یہ تھا ان دونوں کا پہلا تعارف۔

......☆......

وہ پہلی دفعہ پاکستان آیا تھا۔ یہاں کی زندگی برطانیہ کے مقابلے میں یکسر مختلف تھی، مگر اُسے اپنے ملک آکر بہت اپنائیت محسوس ہو رہی تھی۔

وہ پانچ سال کا تھا جب اس کے گھر والے برطانیہ منتقل ہوئے تھے اور اَب پورے آٹھ سال بعد واپس آیا تھا۔ پورا مہینا پَر لگا کر اُڑ گیا۔ روز ہی وہ کہیں نہ کہیں دعوت پر جا رہے ہوتے یا پھر گھومنے نکل جاتے۔

آج چھٹی کا دِن تھا۔ اگلی صبح ان کی واپسی تھی۔ اس کے بابا اپنے پرانے دوستوں سے ملنے گئے تھے، امی اور بہنیں تیاری میں مصروف تھیں۔ دادا، دادی کے ساتھ وہ کب تک گپ شپ لگاتا۔

دادا نے مشورہ دیا:

''تم کچھ دیر ننھے کے پاس چلے جاؤ۔''

''کون ننھا؟'' وہ اسے بھول چکا تھا۔

''ارے، علی کا بیٹا۔''

''اچھا۔ وہ ننھا۔ دادا! وہ کہیں سے بھی ننھا نہیں ہے، وہ تو ایک موٹا ہاتھی لگتا ہے۔''

''بُری بات احمر! ایسے نہیں کہتے۔ گھر والوں کے لاڈ پیار نے اسے ایسا کر دیا ہے۔''

''دادا! ایسا بھی کیا لاڈ پیار؟ کتنا موٹا ہو چکا ہے وہ۔ اگر ہمارے جسمانی ورزش کے استاد صاحب اسے دیکھ لیں تو بے ہوش ہو جائیں۔''

''بس بیٹا! کیا کہہ سکتے ہیں۔ چلو، تم ہو آؤ تھوڑی دیر۔''

وہ بے دلی سے اٹھ کر باہر نکلا۔ برابر گھر کی گھنٹی بجائی، خادم نے

دروازہ کھولا اور وہ اندر چلا آیا۔ انکل کو سلام کیا اور ننھے کا پوچھا۔ حسبِ معمول وہ اپنے کمرے میں ہی تھا۔

دستک پر نیند کی وادیوں میں اترنے کو تیار ننھا ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

''کون ہے؟''

''میں احمر! کیسے ہو منے!؟''

''ٹھیک ہوں۔'' (جمائی)۔ ''منے نہیں ننھے۔'' جمائی روک کر فوراً تصحیح کی گئی۔

احمر مسکرایا۔

''کیا کر رہے تھے؟''

''میں تھک گیا تھا تو سوچا تھوڑا آرام کرلوں۔''

''کیا اسکول کا کام کر رہے تھے؟''

''نہیں تو۔''

''ورزش کر رہے تھے؟''

''نہیں بھئی، بچے ورزش کب کرتے ہیں۔'' نخوت سے جواب دیا۔

''اپنا کمرا صاف کر رہے تھے؟''

''دماغ ٹھیک ہے؟ اس کے لیے ملازم ہے۔'' جھنجلا کر جواب آیا۔

''پھر کیا بازار گئے تھے؟''

''نہیں یار!'' مکمل بے زار لہجہ۔

''تو پھر تھک کیسے گئے؟''

''میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا۔''

''اُف میرے خدا! مجھے لگتا ہے اب تھکن کے مارے تمھیں نیند بھی آ رہی ہوگی موٹو!''

''تمھیں کیسے پتا؟'' ننھے نے حیرت سے پوچھا۔

پھر ایک دم چونک کر بولا: ''یہ موٹو کس کو کہا تم نے؟''

''کسی کو نہیں، اب براہِ مہربانی تم سو جاؤ۔''

وہ غصے میں کھولتا ہوا واپس مڑا۔

''بات سنو، خود کو بہت معتدل اور چاق و چوبند سمجھتے ہو۔ تم نے مجھے موٹو کیسے کہا؟''

''میں حیران ہوں تمھارے گھر والے تمھیں کچھ کیوں نہیں کہتے؟''

''میں نے کیا کیا ہے؟'' وہ بھونڈے پن سے بولا۔

''حد سے زیادہ ہر چیز نقصان دہ ہے۔ تمھیں گھر والوں نے ڈھیر سارا پیار دے کر تمھارا بیڑا غرق کر دیا ہے۔''

''تم ہوتے کون ہو مجھے کچھ کہنے والے؟ سوکھے تنکے!'' ننھے کا غصہ اب عروج پر تھا۔

''تم اپنا موٹاپا دیکھو۔ یہ سب اس لیے ہے کہ ہر وقت کھانا پینا اور ٹھس بیٹھے رہنا۔ تم اس طرح خود کو بیمار کرلو گے۔''

''تم کوئی ڈاکٹر لگے ہو مسٹر!؟ یا کوئی خدائی فوج دار ہو؟'' ننھے نے بمشکل کھڑے ہو کر اُس سے دو، دو ہاتھ کرنے کی ٹھانی۔

''خدا کے لیے اپنے کمرے کی خیالی دنیا سے باہر آؤ۔ مت بنو اپنے آپ کے دشمن۔''

یہ سب کہہ کر وہ رکا نہیں، فوراً پلٹ آیا۔

......☆......

وہ رات ننھے کے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھی۔ اپنی بارہ سالہ زندگی میں کبھی اس نے کسی کی ہلکی سی ڈانٹ تک نہیں کھائی تھی۔

تین بیٹیوں کے بعد وہ پہلا بیٹا تھا۔ گھر بھر کی آنکھوں کا تارا اور سب کا رَاج دلارا۔

ہر چیز بنا کہے اس کے سامنے حاضر ہو جاتی۔ غلط بات پر روک ٹوک کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ہر کوئی اس پر صدقے واری جاتا۔

وہ اپنے کمرے کی پُر آسائش دنیا میں مگن رہتا۔ اماں، بابا اور بہنیں اس کی ہر فرمائش پوری کرنا فرض سمجھتیں۔

اور آج یہ اجنبی لڑکا، جسے وہ صحیح طرح جانتا بھی نہیں تھا، اسے کیا کچھ کہہ گیا تھا!

اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور وہ زور زور سے رونے

لگا۔

اس کے رونے کی آواز سُن کر آن کی آن میں پورے گھر والے جمع ہو گئے۔

”کیا ہوا، الٰہی خیر!“ دادی ہانپتی کانپتی سب سے آخر میں پہنچیں اور اپنے ننھے کو روتا دیکھ کر دِل تھام کر رہ گئیں۔

سب پوچھتے رہے، مگر وہ احمر کا نام نہ لے سکا۔

......☆......

کئی دن یوں ہی خاموشی سے گزر گئے۔ ننھے کے دل میں احمر کے خلاف غصہ، نفرت اور اِنتقام جیسے منفی جذبے امڈتے رہے، مگر جب ان جذبات کا طوفان تھما تو اُسے ہر شے واضح نظر آنے لگی۔ اس نے احمر کی باتوں پر غور کرنا شروع کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ احمر کی باتیں کڑوی، مگر سچ تھیں اور اُسے واقعی خود کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ صرف ایک سوچ کی تبدیلی پل بھر میں زندگی بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

سوچ بدلی تو اگلا دن ایک بڑی تبدیلی کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔

ننھے میاں نے دوسری صبح جلدی اٹھ کر سب کے ساتھ ناشتا کیا، پھر ناشتے کے برتن خود باورچی خانے میں رکھ کر آیا۔ اسی دن سے اپنے کمرے کی صفائی خود شروع کی۔ بہنیں منع کرتی رہ گئیں، ماں کے دل پر آرے چل گئے، مگر ننھا جٹا رہا۔

اس کا سانس بار بار پھولتا رہا، کیوں کہ وہ اپنی عمر کے حساب سے اضافی وزن والا تھا۔ ہر وقت کمپیوٹر پر گیم کھیلنے سے اس کی آنکھوں پر چشمہ لگ چکا تھا اور بیٹھے بیٹھے کھا کھا کر اُس کا جسم سُست ہو چکا تھا۔

اس نے دادا جی کے ساتھ صبح کی سیر پر جانا شروع کیا۔ روز وَرزش اور چہل قدمی کرنے سے اس کے اندر ایک نئی توانائی بھر گئی۔

اپنا ہر چھوٹا بڑا کام وہ اپنے ہاتھ سے کرنے لگا۔ پہلے جو گاڑی میں بیٹھ کر اسکول جایا کرتا تھا اب آنے جانے کے لیے سائیکل استعمال کرنے لگا۔ گھر کا سارا سودا سلف لانے کی ذمے داری اس نے خود لے لی تھی۔

ہر وقت کے بازاری کھانے، برگر، چپس اور ڈَبا بند جوس کے بجائے وہ دال، سبزی، روٹی، دودھ، انڈا اور پھل کھانے لگا اور یہ سب کرنا اس کے لیے لوہے کے چنے چبانے جیسا تھا، مگر وہ ٹھان چکا تھا کہ اسے کرنا ہے، سو وہ کر رہا تھا اور ہر گزرتا دِن اسے یقین دلا رہا تھا کہ وہ صحیح سمت جا رہا ہے۔ وہ خود کو پہلے سے بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔

......☆......

وہ بالکل بدل چکا تھا۔ اب ننھا بقول تمھارے ”موٹو“ تمھارے سامنے پچھلے آدھے گھنٹے سے کیاری کی گوڈی میں لگا ہوا ہے۔

کیاری کی ساری مٹی اتھل پتھل ہو چکی تھی اور اِتنی دیر سے دم سادھے بیٹھا وہ ابوبکر کو پوری توجہ سے سن رہا تھا۔ اس کی آخری بات پر بے یقینی سے اسے تکنے لگا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔ کیا واقعی تم ہی ننھے ہو؟ خود کو اِتنا بدل لیا کہ میں بھی پہچان نہیں پایا۔ میری باتوں نے جادو سا اثر کر دیا۔ حیرت انگیز!“ احمر مسرت سے لبریز لہجے میں گویا ہوا۔

”میں تمھارا اِحسان مند ہوں کہ تم نے میری زندگی میں ایک ناقابلِ فراموش کردار اَدا کیا۔“ ابوبکر مسکرا کر اِحسان مندی سے بولا۔

”اب کیا کیا کرتے ہو؟“ احمر نے تجسس سے پوچھا۔

اسی وقت عصر کی اذان شروع ہو گئی تو دونوں خاموش ہو گئے۔

”یہ سوال چھوڑو کہ میں اب کیا کیا کرتا ہوں۔ تم بتاؤ، نماز پڑھتے ہو؟“ ابوبکر نے اپنائیت سے پوچھا۔

”ہاں جمع کو۔ دراصل برطانیہ میں ہمارے معمولات ذرا سخت......“ احمر شرمندگی سے بولا۔

”چلو دوست! نماز کے لیے چلتے ہیں۔“ ابوبکر عرف ننھے نے نرم لہجے میں کہا۔

”تمھارے احسان کا کچھ تو بدلہ دینا ہے، اب تبدیلی تمھارے اندر بھی آ کر رہے گی، ان شاءاللہ!“

ابوبکر کی بات سن کر وہ مسکرایا اور دونوں مسجد کی جانب چل پڑے۔

کوہستان کے جزیرے پر ایک اسکول تھا جس کا نام ''علم کی روشنی'' تھا۔ اس اسکول میں ہر طبقے کے بچے پڑھتے تھے۔ امیر ہو یا غریب، سب کو ایک ہی نظر سے جانچا جاتا تھا۔ پہلی جماعت میں منٹو، گلہری، الو اور شیخ چلی پڑھتے تھے۔ منٹو بہت ذہین تھا، ہر سال جماعت میں اول وہی آتا تھا۔ منٹو کو اگر کوئی مات دے سکتا تھا تو وہ صرف شیخ چلی تھا، لیکن شیخ چلی صرف وقت ضائع کرتا رہتا تھا، جس کی وجہ سے پڑھائی میں وہ منٹو کو پیچھے کرنے سے قاصر تھا۔ شیخ چلی ذہین ہونے کے باعث اسی خام خیالی میں رہتا اور خود کو تسلی دیتے ہوئے کہتا:

''شیخ چلی! تمھیں کیا پریشانی؟ تم تو آخری وقت میں پڑھ کر بھی کام یابی حاصل کر سکتے ہو۔''

وہ اسی دھن میں اپنا وقت ضائع کرتا رہتا تھا اور یہی عادت اس سے آخری لمحات بھی ضائع کروا دیتی تھی۔ منٹو جماعت کا وہ طالب علم تھا جو نظام الاوقات کے حساب سے چلتا تھا۔ اس نے اپنے گھر میں اپنے کمرے کی دیوار پر بھی ایک نظام الاوقات بنا کر چسپاں کر رکھا تھا اور ایک نظام الاوقات اپنے بستے میں رکھا ہوا تھا، تا کہ وہ اس حساب سے اپنے سارے کام بروقت کر سکے۔ یہی اس کی کام یابی کا راز تھا۔ وہ اپنے باقی دوستوں کو بھی اس کی تلقین کرتے ہوئے کہتا:

''دوستو! اگر زندگی میں کام یاب ہونا چاہتے ہو تو ہر کام بَروقت کیا کرو، وقت کو ضائع کرنا اچھی بات نہیں ہے۔''

گلہری ذہنی طور پر تھوڑی کمزور تھی۔ وہ ہر وقت رٹا مارنے کی کوشش کرتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ رٹا مار کر وہ اچھے نمبروں سے کام یاب ہو سکتی ہے، لیکن یہ بات بالکل غلط تھی۔ جب استانی اسے مخاطب کر کے کہتیں:

''گلہری! تم بتاؤ، دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟''

تو گلہری خوشی خوشی خود اعتمادی کے ساتھ جواب دینے کے لیے کھڑی تو ہو جاتی، پھر سَر کھجاتے ہوئے جواب دیتی:

''مس! دو اور دو...... دو اور دو...... ہاں دو اور دو، پانچ ہوتے ہیں۔''

جماعت کے سارے بچے گلہری پر خوب ہنستے۔ منٹو اُسے ہمیشہ کہتا:

''گلہری! تم تھوڑا تھوڑا پڑھ لیا کرو، لیکن جو بھی پڑھو وہ سمجھ کر

منٹو، گلہری اور شیخ چلی

تابندہ طارق عکس۔ چکوال

پڑھا کرو۔''

''منٹو! سمجھ کر پڑھنے سے کیا ہوگا؟''

''گلہری! جو سبق تم سمجھ کر پڑھو گی وہ تم کبھی نہیں بھولو گی، وہ تمھیں ہمیشہ یاد رہے گا۔''

گلہری منٹو کی باتوں پر غور کرنے کے بعد کہنے لگی:

''منٹو! میں تمھاری بات سے اتفاق کرتی ہوں اور آج کے بعد رٹا لگانے کے بجائے سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کروں گی، تاکہ شرمندگی سے دوچار نہ ہونا پڑے۔''

الو زور زور سے آنکھیں موندے بڑبڑایا:

''میں نے ٹرافی جیت لی...... میں نے ٹرافی جیت لی۔''

منٹو، گلہری اور شیخ چلی اس کے اردگرد جمع ہو گئے اور اُسے جھنجھوڑ کر گویا ہوئے:

''الو میاں! ارے الو میاں!''

لیکن الو اپنی ہی مستی میں مست تھا، ابھی بھی چلائے جا رہا تھا۔ شیخ چلی نے زور سے اس کے سَر پر کتاب ماری اور کہنے لگا:

''اے رات کے سپاہی! اب کچھ دماغ پر زور پڑا ہے یا ایک اور لگاؤں؟''

منٹو ہنستے ہوئے کہنے لگا:

''یہ رات بھر سوتا نہیں اور دِن بھر خواب دیکھنے سے فرصت نہیں۔''

گلہری بھی بولے بغیر نہ رہ سکی، اس نے بھی اپنا حصہ ڈالا:

''الو ہر روز خوابوں میں دو تین ٹرافیاں تو جیت ہی لیتا ہے۔''

سب نے یک زبان ہو کر قہقہہ لگایا۔ اس کی آواز سے الو کی آنکھ کھلی اور اُداس لہجے میں کہنے لگا:

''تم سب میرا مذاق اڑا رہے ہو؟''

منٹو کہنے لگا:

''ہم سب مذاق نہیں اڑا رہے، بس تمھاری خوابی ٹرافیاں گننے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔''

سب نے اثبات میں سر ہلایا اور اُلو کی طرف دیکھا، وہ دوبارہ سو چکا تھا۔ شیخ چلی کہنے لگا:

''اس الو کے لیے کوئی رات کا اسکول ہونا چاہیے، دن بھر یہ سوتا رہے اور رات بھر پڑھتا رہے۔''

گلہری کہنے لگی:

''شیخ چلی! ایسا اسکول پھر اُلوؤں کا خاندان ہی بنا سکتا ہے، کیوں کہ وہی اس کی طرح رات بھر جاگ کر اِسے پڑھانے کی سکت رکھ سکتے ہیں۔''

......☆......

امتحان کے دن قریب آرہے تھے۔ منٹو نظام الاوقات کے حساب سے پڑھائی کر رہا تھا۔ گلہری نے بھی منٹو کی بات مانی اور ہر موضوع کو سمجھ کر پڑھنے کی ٹھان لی۔ رفتہ رفتہ اسے مشکل موضوع بھی آسان لگنے لگا اور سمجھ کر پڑھنے کی وجہ سے اسے سبق یاد رہنے لگا۔ شیخ چلی حسبِ معمول یہی کہتا رہتا:

''شیخ چلی! تم تو بہت ذہین ہو، آخری دن میں بھی پڑھ کر کامیاب ہو جاؤ گے۔''

الو دِن بھر جماعت میں ہوتے ہوئے بھی سوتا رہتا، جس کی وجہ سے اسے سبق کے متعلق کچھ پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ رات بھر بستہ اور کتابوں کو سامنے رکھ کر خود سے ہم کلام ہوتا:

''جماعت میں سونے کی وجہ سے مجھے پتا ہی نہیں ہے کہ مس نے کیا پڑھایا اور کیا سمجھایا تھا؟''

امتحان کے بعد جب نتیجے کا دِن آیا الو تب بھی سو رہا تھا۔ منٹو اور گلہری مطمئن نظر آرہے تھے، کیوں کہ گلہری نے بھی سمجھ کر پڑھا اور اِمتحان دیے تھے۔ منٹو کا چہرہ اترا ہوا تھا اور وہ پریشانی میں مبتلا تھا، کیوں کہ وہ اپنی ذہانت کے چکر میں سارا وقت ضائع کر چکا تھا۔ جب نتیجہ سنایا گیا تو حسبِ روایت منٹو نے اول درجہ حاصل کیا تھا اور گلہری نے درجہ دوم سے کامیابی حاصل کر لی تھی، جس پر وہ بہت خوش تھی۔ وہ منٹو سے مسکراتے ہوئے کہنے لگی:

’’منٹو! آج تمھاری نصیحت کی وجہ سے میں نے درجہ دوم سے کام یابی حاصل کی ہے۔ شکریہ میرے دوست!‘‘

منٹو بہت خوش تھا کہ گلہری نے اس کی نصیحت پر عمل کیا اور ہر موضوع کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کی تھی۔ منٹو نے گلہری سے کہا:

’’گلہری! میں نے تو صرف نصیحت کی تھی، اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا تم پر منحصر کرتا تھا، تم نے عمل کیا اور کام یاب ہو گئیں۔‘‘

شیخ چلی اپنا نتیجہ سن کر غم زدہ ہو گیا اور کہنے لگا:

’’کاش! میں وقت کو ضائع نہ کرتا تو آج کم از کم ناکام نہ ہوتا، لیکن مجھے میری ذہانت نے مغرور کر دیا تھا، جس کی وجہ سے ناکامی میرا مقدر بنی۔‘‘

منٹو اور گلہری، شیخ چلی کو سمجھانے لگے کہ زندگی میں ہر ناکامی ایک سبق سکھاتی ہے، تم بھی اس سے سبق سیکھو اور وقت کو ضائع مت کیا کرو، اپنی ذہانت کا استعمال کر کے کام یابی حاصل کرو۔ شیخ چلی نے منٹو اور گلہری سے وعدہ کیا کہ آج کے بعد وہ وقت کی قدر کرے گا۔

اتنے میں الو کی آواز نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی:

’’میں ٹرافی جیت گیا...... میں ٹرافی جیت گیا۔‘‘

گلہری، منٹو اور شیخ چلی یک زبان ہو کر بولے:

’’الو! خوابوں کی دنیا سے واپس آؤ، ناکام ہو گئے ہو تم۔ جماعت میں بھی سوتے رہتے تھے اور امتحان میں بھی سوتے ہوئے خالی پرچے چھوڑ کر آج ناکام ہونے کی ٹرافی جیت لی ہے۔‘‘

الو نے آدھی آنکھ کھولی، ان کی بات سنی اور اس سے پہلے کہ وہ شرمندگی محسوس کرتا اس کی آنکھیں دوبارہ مکمل بند ہو گئی تھیں۔ منٹو، گلہری اور شیخ چلی سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگے:

’’لو بھئی، یہ الو کا بچہ تو پھر سو گیا۔‘‘

یہ کُل پانچ اشارات ہیں۔ آپ ان کی مدد سے درست جواب تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔ اگر آپ ان اشارات کے ذریعے درست جواب تک پہنچ جائیں تو بُوجھا گیا جواب آخری صفحے پر موجود کوپن کے ساتھ ہمیں ارسال کر دیجیے اور اپنی معلومات کا انعام ہم سے پائیے۔

آپ کا جواب 31 جولائی تک ہمیں پہنچ جانا چاہیے۔ جوابات واٹس اَپ پر بھی بھیجے جا سکتے ہیں کوپن کو قلم سے بھر کر، پنسل سے نہیں۔

یہ کیا ہے؟

13

1۔ یہ ایک پَروں والا کیڑا ہے جو عموماً رات کے وقت زیادہ سرگرم رہتا ہے۔

2۔ اس کا تعلق حشرات کے اس طبقے سے ہے جس میں تتلیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔

3۔ اس کے مُحاس (اینٹینے) عموماً کنگھی یا پنکھ جیسی شکل رکھتے ہیں، جب کہ تتلی کے مُحاس کے سِرے گول ہوتے ہیں۔

4۔ اپنی زندگی کے دوران میں یہ انڈا، لاروا (سنڈی)، کویا اور پھر پَردار شکل کے چار مراحل سے گزرتا ہے۔

5۔ دنیا کے سب سے بڑے پَردار کیڑوں میں شمار ہونے والا ’’ایٹلس موتھ‘‘ بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔

سعد علی چھیپا۔ کراچی

انعام

انعم توصیف۔ کراچی

’’ابوذر! نیچے آؤ فوراً۔‘‘ امی نے اسے آواز دی۔

ابوذر نے غلیل کو اُٹھا کر الماری میں رکھا اور جلدی سے نیچے کی طرف دوڑ لگائی۔

’’اللہ تعالیٰ نے بچا لیا۔‘‘ ابوذر نے خود کلامی کی۔

وہ نیچے آیا تو امی اس کے کپڑے استری کر رہی تھیں۔ اس نے استفہامیہ نظروں سے امی کو دیکھا۔

’’نماز کی ادائیگی کا وقت ہونے والا ہے۔‘‘ امی نے کپڑے اس کی طرف بڑھائے۔ ان کے چہرے سے ان کی ناراضی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

’’آنے دو آج ابو کو، بتاؤں گی انھیں پورا وقت چھت پر......‘‘ ابوذر کا دِماغ غلیل میں اٹکا ہوا تھا۔ امی کی ڈانٹ کا بھی اس پر اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے کپڑے لیے اور جلدی سے نہانے چلا گیا۔

......☆......

’’انڈے لے آئے؟‘‘ نماز پڑھ کر ابوذر گھر لوٹا تو امی نے اس سے پوچھا۔

’’وہ...... مسجد میں امام صاحب درس دے رہے تھے، وہاں بیٹھ گیا تھا، پھر......‘‘ ابوذر ڈرتے ہوئے بتانے لگا۔

’’ابھی لے کر آتا ہوں انڈے۔‘‘ ابوذر نے مزید کچھ کہنے کے بجائے الٹے قدموں باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

’’اللہ اکبر! کیا ہوتا جا رہا ہے اس بچے کو۔‘‘ امی نے اپنا سر تھام لیا۔

......☆......

’’آپ بتایئے ابوذر!‘‘ امام صاحب نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

’’میں...... جی نیکی کا مطلب ہوتا ہے اچھے کام کرنا۔ کسی کی مدد کرنا نیکی ہے، کسی کو تکلیف نہ دینا نیکی ہے۔‘‘ ابوذر نے اٹکتے ہوئے جواب دیا۔

''شاباش!'' امام صاحب کی حوصلہ افزائی سے وہ خوشی سے پھولے نہ سمایا۔

''نیکی، نیک اعمال کو کہتے ہیں۔ جس کام کو کرنے سے اللہ پاک خوش ہوں، جسے کرنے سے کسی انسان یا کسی بھی ذی روح کو فائدہ ہو۔ کسی بُرائی سے رکنا بھی نیکی ہے، بل کہ یہ نیکیوں کی سردار نیکی ہے۔ نیکیاں کر کے جو سکون ہمیں ملتا ہے اس کا نعم البدل کچھ ہو ہی نہیں سکتا، پھر اللہ پاک دنیا اور آخرت میں ان نیکیوں کا انعام بھی خوب دیتے ہیں۔'' امام صاحب تفصیل سے بتانے لگے۔

ابوذر کی مسجد کے امام صاحب عصر کی نماز کے بعد دَرس دیتے تھے اور پھر محفل میں موجود لوگوں سے سوالات کرتے تھے۔ اس طرح وہاں موجود لوگوں کے علم میں خوب اضافہ ہوتا تھا۔

ابوذر جواب دے کر بہت خوش تھا، مگر اُس کا ذہن الجھ رہا تھا۔

......☆......

ابوذر کے اسکول کی چھٹیاں چل رہی تھیں۔ وہ ہر وقت کچھ نیا کرنے کی دھن میں رہتا تھا۔ آج کل اس کا مشغلہ ایک مینا کو پکڑنا تھا، جو اکثر اُس کے گھر کے سامنے درخت پر آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ وہ ابو، امی سے چھپ کر غلیل بھی خرید لایا تھا۔ اسے غلیل کا شوق ایک ویڈیو دیکھ کر ہوا تھا۔ غلیل کا استعمال بھی اس نے انٹرنیٹ سے ہی سیکھا تھا۔

''آج تو میں تمھیں پکڑ ہی لوں گا۔'' ابوذر نے انگلیوں میں تھامی غلیل کا نشانہ درخت پر بیٹھی مینا کی طرف لگایا۔ مینا پُھر سے اُڑ کر دوسرے درخت پر بیٹھ گئی۔

''اس مینا کے ساتھ ہی مسئلہ ہے، ورنہ میں تو درست نشانہ لگا رہا ہوں۔'' انگور کھٹے ہیں کی مانند اُس نے مینا کو دیکھا۔ دھوپ کی تمازت سے اس کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کوشش کرتا، ابو کی اسکوٹر کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی اور وہ جلدی سے نیچے کی طرف بھاگا۔

......☆......

''امی! میں یہ پیالہ لے رہا ہوں۔'' امی باورچی خانے میں کھڑی املی اور آلو بخارے کا شربت بنا رہی تھیں، تب ہی ابوذر وہاں آیا۔ امی کے سوال کرنے سے پہلے ہی وہ بتانے لگا:

''امام صاحب نے کل کہا تھا کہ ہمیں گرمی میں انسانوں کے ساتھ پرندوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔'' امی کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''شاباش!'' انھوں نے مختصراً کہا اور ذِکر کرتے ہوئے اپنا کام کرنے لگیں۔

......☆......

ابوذر نے چھت پر رکھی پرانی بے کار انگیٹھی کے اوپر پانی سے بھرا پیالہ رکھا، پھر وہاں سے ہٹ کر دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ پرندے اپنی پیاس بجھانے وہاں آنے لگے۔ وہی مینا جسے ابوذر روز پکڑنے کی کوشش کرتا تھا، وہ بھی وہاں آ بیٹھی۔ ابوذر نے اسے دیکھا تو اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے پہلے غلیل اٹھانے کا ارادہ کیا، لیکن پھر اچانک مینا پر ہاتھوں سے حملہ کیا۔ اس افتاد پر مینا سٹپٹا گئی اور اُس کی پکڑ میں آ گئی۔

''اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے! مجھے تو پانی رکھنے کی نیکی کا انعام فوراً ہی مل گیا۔'' ننھی مینا کو دیکھ کر ابوذر نے ہنستے ہوئے کہا۔ مینا کے چہرے پر خوف کے سائے لہرا رہے تھے۔ وہ گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ابوذر نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو مینا کا بچہ اسے حسرت سے تک رہا تھا۔

''بُرائی سے رکنا بھی نیکی ہے۔'' ابوذر کو لگا کہ ننھا مینا کا بچہ اسے کہہ رہا ہو۔ اس نے ایک نظر اپنے شکار کو دیکھا اور استغفر اللہ کہتے ہوئے مینا کو آزاد کر دیا۔

سکون کے احساس نے اسے گھیر لیا۔ نیک لوگوں کی صحبت کا انعام اسے دل کی نرمی کی صورت مل گیا تھا۔ اس نے غلیل کو ایک نظر دیکھا اور اُسے کچرا دان میں پھینکنے کے لیے نیچے کی طرف دوڑ لگا دی۔

ہماری مرضی سے

کیسے!؟ 4

ڈاکٹر عاصم بھروچہ۔ کراچی

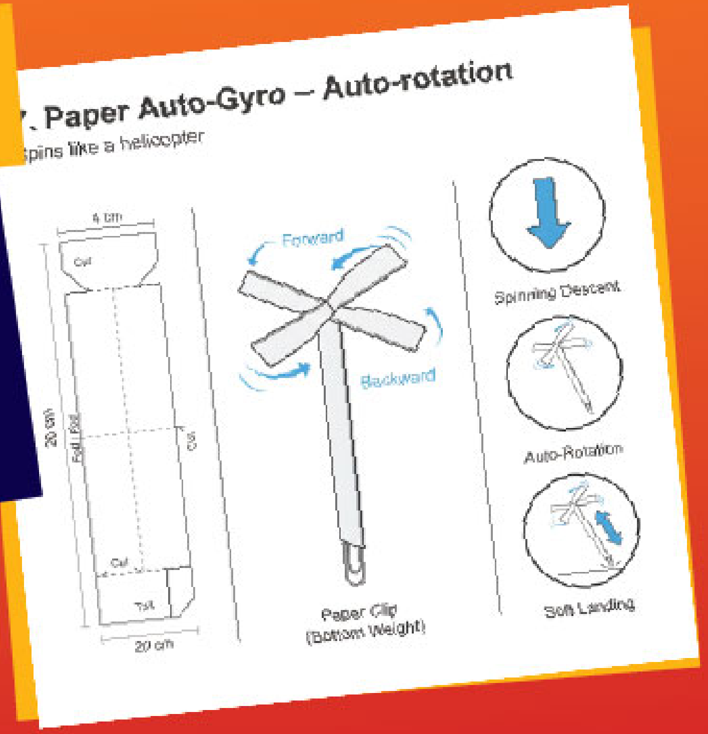

5۔ کناروں کی طرف سے تھوڑے سے اوپر کی طرف مڑے ہوئے پَر (Winglets)

طریقہ:

1. جہاز کے پروں کے آگے یا پیچھے کناروں کو 1 سینٹی میٹر (cm) چوڑائی میں اوپر کی طرف لپیٹ دیں۔
2. ایک جہاز بغیر مڑے ہوئے پروں والا، دوسرے مڑے ہوئے پروں والے جہاز کے ساتھ رکھ کر مقابلہ کریں، یعنی دونوں جہاز ایک ایک مرتبہ چلائیں۔

کیا دیکھیں گے:

☆ مڑے ہوئے پروں والا جہاز عموماً سیدھا اور تھوڑی دور تک اُڑے گا، اُلٹا سیدھا ہوتا کم محسوس ہوگا۔

☆ بغیر مڑے ہوئے پروں والا جہاز کبھی کبھی اونچائی کی طرف گردش کر کے قوت ضائع کرتا ہے۔

کیوں:

کناروں پر بننے والا ہوا کا گھماؤ اوپر نیچے کرتا ہے، پروں کے مڑے ہوئے کنارے اسے کم کرتے ہیں اور توانائی بچتی ہے۔

اگر نتیجہ نہ آیا تو:

☆ اگر کنارے ایک جیسے نہ موڑے گئے ہوں تو جہاز ایک طرف گھوم سکتا ہے، لہٰذا دونوں طرف کے کنارے ایک جیسے کریں۔

☆ اگر پروں کے کنارے بہت زیادہ موڑ دیے گئے ہوں تو اضافی وزن اور جہاز کا جھکنا بڑھ سکتا ہے، صرف ہلکے اور 1 سینٹی میٹر کے کافی ہیں۔

......(جاری ہے)......

التجا

رضوان اللہ عاطر۔ مالئی

الٰہی! مل گئی راہِ ہدایت تیری رحمت سے
منور ہو گئے سینے بصیرت کی حلاوت سے

مگر یہ دل تو ہیں لرزاں ، تغیر ان کی فطرت ہے
بچا لینا ہمیں مولا! ہر اک لغزش کی آفت سے

عطا کر اپنی رحمت سے ہمیں وہ استقامت بھی
قدم نہ ڈگمگائیں ، یہ ملے ہم کو سعادت بھی

امیدیں تجھ سے جوڑی ہیں ، تُو ہی مشکل کشا ٹھہرا
خزانے تیرے بے حد ہیں ، تُو ہی سب سے بڑا داتا

تیری بخشش کا کیا کہنا ، تُو بے مانگے بھی دیتا ہے
خطا کاروں پہ بھی اپنا کرم تُو خوب کرتا ہے

جسے چاہے ہدایت دے ، جسے چاہے تُو چن لے خود
تُو وہ وہاب ہے جو جھولیاں ہر دم ہی بھرتا ہے

خدایا! عاطرؔ خستہ کی بس یہ عرضِ آخر ہے
تیری رحمت ہی بس منزل ، تیرا در ہی تو محور ہے

قارئین

بکھرے موتی

☆سنتیں زندگی کو خوب صورت ترتیب دے دیتی ہیں۔
☆سچی دوستی میں مقابلہ نہیں، خیال رکھا جاتا ہے۔
☆جو سیکھ کر عمل نہ کرے، وہ خزانہ رکھ کر بھی فقیر ہے۔
☆اچھا دوست آئینہ ہوتا ہے۔
☆اللہ تعالیٰ کی خوشی کے لیے کیا گیا کام کبھی ضائع نہیں ہوتا۔

(ایمن فاطمہ۔کراچی)

☆دوستی وہ ہے جس میں خیرخواہی چھپی ہو۔
☆کمزور کا سہارا بننا اصل طاقت ہے۔
☆سنت طریقے پر چھوٹا عمل بھی بڑا اجر لے کر آتا ہے۔
☆مسکراہٹ بھی کسی کے لیے سہارا بن سکتی ہے۔
☆سنتوں سے جڑی زندگی میں سکون ہی سکون ہوتا ہے۔

(ناہید مشتاق۔ٹھٹھہ)

☆اچھے اخلاق وہ خوش بو ہیں جو ہر دِل کو بھا جاتی ہے۔
☆وقت کی قدر کرنے والا کبھی پیچھے نہیں رہتا۔
☆سچ بولنے والا انسان سب کے دل میں جگہ بنا لیتا ہے۔

(فہیم بن یاسین۔حیدرآباد)

☆صفائی پسند انسان سب کو اچھا لگتا ہے۔
☆غصہ عقل کے دروازے بند کر دیتا ہے۔
☆چھوٹی نیکی بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑی ہو سکتی ہے۔

(ضحیٰ بنت شعیب اسلم۔رحیم یار خان)

☆وعدہ پورا کرنا ایمان دار ہونے کی پہچان ہے۔
☆جو دُوسروں کو خوشی دیتا ہے وہ خود بھی خوش رہتا ہے۔
☆ادب انسان کو عام سے خاص بنا دیتا ہے۔
☆محنت کرنے والے کو ناکامی بھی کچھ نہ کچھ سکھا جاتی ہے۔

(محمد شاہد۔لودھراں)

☆زبان کی مٹھاس دلوں کو جوڑ دیتی ہے۔
☆دوسروں کی مدد کرنے والا کبھی اکیلا نہیں رہتا۔
☆اچھا انسان غلطی مان لینے میں شرم محسوس نہیں کرتا۔
☆دعا مومن کا سب سے خوب صورت سہارا ہے۔

(صفیہ سہیل۔لاہور)

☆حسد دِل کی خوشیاں چُرا لیتا ہے۔
☆اچھی کتابیں بہترین دوست ہوتی ہیں۔
☆شکرگزار دِل ہمیشہ سکون میں رہتا ہے۔
☆نرمی سے کہی گئی بات سخت دل کو بھی بدل سکتی ہے۔
☆اندھیرے میں جلنے والا چراغ ہی اصل روشنی دیتا ہے۔

(نازیہ عمران۔اسلام آباد)

☆دوسروں کی عزت کرنے والا خود بھی عزت پاتا ہے۔
☆ہر کامیابی صبر اور محنت کے راستے سے گزرتی ہے۔
☆اچھے الفاظ دلوں کے زخم بھی بھر دیتے ہیں۔

(محمد رضوان۔گلگتی)

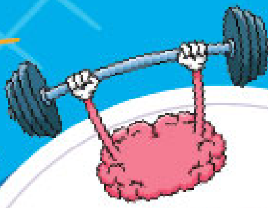

سوال آدھا جواب آدھا 81

الطاف حسین مرحوم۔ راولپنڈی

اس کھیل میں چند جملے ہیں، ہر جملہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں کچھ معلومات دی گئی ہیں، جب کہ دوسرے حصے میں اسی طرح کی معلومات آپ سے پوچھی گئی ہیں۔ آپ مطلوبہ معلومات ہمیں 31 جولائی تک ارسال کر دیجیے۔

ایک سے زیادہ درست جوابات موصول ہونے کی صورت میں قرعہ اندازی کے ذریعے تین قارئین کرام کو انعام سے نوازا جائے گا۔ کوپن پُر کر کے ساتھ بھیجنا نہ بھولیے گا۔ کوپن بھر کر آپ جواب اور کوپن واٹس ایپ بھی کر سکتے ہیں، لیکن کوپن قلم سے بھریے گا، پنسل سے نہیں۔

1۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ یونس سے سورۂ حجرات تک کی سورتوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ سورتیں مجھے ''زبور'' کے بدلے میں عطا کی گئی ہیں...... بتایئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کن 7 طویل سورتوں کا نام لے کر فرمایا تھا کہ یہ سورتیں مجھے ''تورات'' کے بدلے میں عطا کی گئی ہیں؟

2۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام کو نبوت عطا کی تھی...... بتایئے اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد کسے نبوت کے منصب پر فائز فرمایا تھا؟

3۔ ''توزکِ بابری'' پہلے مغل بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر کی تحریر کردہ کتاب ہے، اس میں انھوں نے اپنی زندگی کے حالات تحریر کیے ہیں...... آپ یہ بتایئے کہ ''توزکِ جہانگیری'' کے مصنف کا کیا نام تھا؟

4۔ ''شاہی قلعہ'' لاہور میں واقع ہے...... بتایئے ''قلعہ بالا حصار'' پاکستان کے صوبہ خیبر پختون خوا کے کس شہر میں واقع ہے؟

5۔ نظامِ شمسی کا (قطر کے لحاظ سے) سب سے بڑا سیارہ مشتری ہے، جس کا قطر 88700 میل ہے...... بتایئے قطر کے لحاظ سے سب سے چھوٹا سیارہ کون سا ہے؟

6۔ ''موہن جو دڑو'' کے آثارِ قدیمہ پاکستان کے صوبہ سندھ میں واقع ہیں...... بتایئے ''ہڑپہ'' کے آثارِ قدیمہ پاکستان کے کس صوبے میں واقع ہیں؟

7۔ جاپان کے قومی ترانے کا عنوان ہے ''شاہ کی حکومت ہزاروں سال جاری رہے!'' بتایئے چین کے قومی ترانے کا عنوان کیا ہے؟

8۔ اقوامِ متحدہ کے رکن ممالک ہر سال 26 جون کو ''یومِ انسدادِ منشیات'' مناتے ہیں...... بتایئے ''ایڈز کا عالمی دن'' کس تاریخ کو منایا جاتا ہے؟

9۔ ''روم'' (ROM) کمپیوٹر کی اصطلاح میں ''Read Only Memory'' کا مخفف ہے...... بتایئے ''ریم'' (RAM) کس کا مخفف ہے؟

10۔ ''چھوٹا منہ بڑی بات'' اردو زبان کی ایک مشہور ضرب المثل ہے، جس کا مطلب ہے: ''اپنی عقل سے زیادہ بات کرنا''...... بتایئے ''جیتی مکھی نگلی نہیں جاتی'' کا کیا مطلب ہے؟

ساجھے کی ہنڈیا

2

حافظہ سویرا چودھری۔ ملتان

محلے بھر میں ''العمر سائنس ہائی اسکول'' کے افتتاح کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیلی تھی۔ سب سے پہلے خالہ آسیہ اپنے تین بچوں کے ساتھ حاضر ہوئیں۔

''میں نے سنا ہے کہ تم نے اسکول کھول لیا ہے اور فیس بھی بہت کم رکھی ہے؟''

''جی، آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔''

اماں نے مسکرا کر جواب دیا۔ وہ پُرسکون ہوتے ہوئے مزید گویا ہوئیں:

''بس پھر میرے بچے اب اسی اسکول میں پڑھیں گے، کیوں کہ پہلے والے اسکول سے تو میں انھیں ہٹا چکی ہوں۔''

''بہن! وہاں سے کیوں ہٹا لیا تھا آپ نے؟''

اماں بے اختیار متجسس ہو گئیں۔

''ان کے ابو کی بیماری، پھر اتنی مہنگائی، ایسے میں غریب کے بچے بھلا کہاں پڑھ سکتے ہیں!''

خالہ آسیہ نے رونی صورت بنالی۔ میں نے ان کی تسلی کے لیے فوراً اپنا حصہ ڈالا:

''جی، ہمارا اسکول کھولنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ پاکستان کا ہر بچہ تعلیم حاصل کر سکے۔''

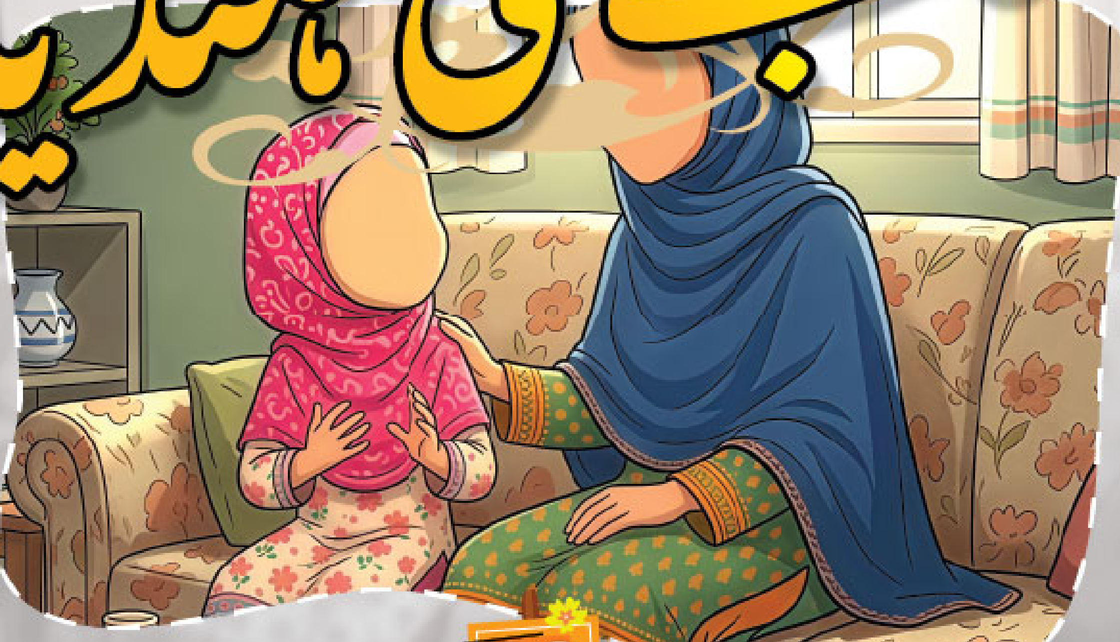

’’تو پھر کیا فیس ہے آپ کی؟‘‘
وہ اصل بات کی طرف آئیں، جواباً میں نے شائستہ انداز میں عرض کیا:
’’جی، دراصل ہفتے کو داخلے کے خواہش مند تمام بچوں کا انٹرویو لیا جائے گا، تعلیمی قابلیت جانچی جائے گی۔ جس کے نتیجے میں ان کی جماعت اور فیس کا تعین کرنا آسان ہو جائے گا۔‘‘
’’یہ تو بہت اچھا طریقہ ہے، ہمارے بچے بھی انٹرویو دیں گے، ورنہ تو اَب تک امیروں کے بچوں کے انٹرویو کے متعلق ہی سنا تھا۔‘‘
وہ سادگی سے مسکرائیں، میں نے جوابی مسکراہٹ ہونٹوں پر چپکالی۔ خالہ آسیہ کو رُخصت کرکے اماں جیسے ہی پلٹیں، میں نے گول گول گھومنے کے بعد اُنھیں مبارک باد دِی۔ وہ بھی کافی خوش نظر آ رہی تھیں۔
’’تین بچوں کا داخلہ تو سمجھیں ہو چکا ہے۔‘‘
’’اور یہ بھی اچھا ہے کہ قریب کوئی سرکاری اسکول نہیں ہے، ورنہ یہ سب اسی پر دَھاوا بول دیتے۔‘‘
اماں نے شکر منایا تو میں نے بھی فوراً اثبات میں سر ہلا دِیا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ بشریٰ کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ جلد ہی میں اماں کے فون سے چچا کے گھر کا نمبر ملا رہی تھی۔
’’مبارک ہو بشریٰ!‘‘
سلام دعا کے فوراً بعد میں نے اسے مبارک باد دِی۔ اس نے حیرانی سے دریافت کیا:
’’مگر کس بات کی؟‘‘
ارے آسیہ خالہ آئی تھیں اپنے تین بچوں کو داخل کروانے۔ اور......‘‘
میں جلدی جلدی بتانے لگی۔ اس کی بھی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔
’’واہ! کتنا اچھا لگے گا جب محلے بھر کی خواتین اپنے بچوں کی استانیاں ہونے کے ناتے ہمارا اَدب کیا کریں گی۔‘‘
چشمِ تصور میں، میں نے دیکھا کہ بھری محفل میں خواتین اٹھ اٹھ کر ہمیں سلام کر رہی ہیں۔ کوئی بیٹھنے کے لیے اپنی نشست پیش کر رہی ہے تو کوئی پانی کا گلاس! آسیہ خالہ تو باقاعدہ دستی پنکھے سے ہوا دیتی نظر آنے لگیں۔
ابھی شاید یہ جاگتی آنکھوں کا خواب میں مزید دیکھتی رہتی کہ بیرونی دروازے کے دھڑ دھڑانے سے چونک کر ہوش میں آئی، اماں دروازہ کھول رہی تھیں۔
آنے والی خاتون کوئی اور نہیں، ہمارے سامنے گھر کی سدرہ خالہ تھیں۔ وہ اپنی دو عدد سوتیلی بیٹیوں کے ہم راہ اندر داخل ہوئیں اور چھوٹتے ہی اپنے مخصوص انداز میں سوال داغ دیا:
’’یہ بیٹھے بٹھائے تم لوگوں کو کیا سوجھی بھئی!؟‘‘
’’بس جی! خدمتِ خلق کا جذبہ تو میری بچی میں بچپن سے ہی موجود تھا، اب جیسے ہی موقع میسر آیا تو اُس نے عملی قدم بھی اٹھا لیا ہے۔‘‘
اماں نے انکساری کا بہترین مظاہرہ کیا۔ میں نے کن اکھیوں سے سدرہ خالہ کے چہرے کے تاثرات جانچے، جن پر ناگواری کا تاثر بخوبی محسوس کیا جا سکتا تھا۔ ان کا مزاج بحال کرنے کی غرض سے گلا صاف کرتے ہوئے میں نے پوچھا:
’’یہ پیاری پیاری بچیاں آپ کی ہیں نا!؟‘‘
’’ہاں، پورے محلے کو پتا ہے کہ یہ میری سوتیلی بیٹیاں ہیں اور آج انھی کے لیے آئی ہوں۔‘‘
ان کی خشک مزاجی میں کوئی فرق نہ آیا تھا، پھر ایک بچی کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولیں:
’’مہنگائی کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہوئے میں نے انھیں اسکول بھیجنا بند کر دیا تھا، خاندان بھر نے مجھ پر وہ تیر برسائے کہ توبہ ہی بھلی! سب کا خیال تھا کہ میں نے ان کا اسکول چھڑوا کر سوتیلی ماں ہونے کا ثبوت دیا ہے، مگر میری مجبوری کسی نے نہ سمجھی۔ خیر، جب سے یہ سنا ہے کہ تم لوگ کم فیس میں بچوں کو اِسکول پڑھاؤ گے تب سے دل میں ایک امید بندھ گئی ہے کہ شاید میں پھر سے

خاندان والوں کی نظروں میں معتبر ہو جاؤں۔‘‘

’’جی، جی، ان شاء اللہ، ان شاء اللہ! آپ کو آپ کا کھویا ہوا مقام مل کر رہے گا۔‘‘

اماں نے ایک عزم کی صورت میں بلند آواز سے کہا۔ میں نے ستائش بھری نگاہ ان پر ڈال کر سدرہ خالہ کو مخاطب کیا:

’’آپ ہفتے سے اپنی بچیوں کو بھیج دیجیے گا۔ اولاً تو سب بچوں کا ایک ہلکا پھلکا سا انٹرویو لیا جائے گا، جس کے نتیجے میں ان کی جماعت اور فیس بھی مقرر کرنا آسان ہوگا، پھر پیر سے پڑھائی کا باقاعدہ آغاز کر دیا جائے گا۔‘‘

’’جی ٹھیک ہے، میں بالکل ایسا ہی کروں گی، مگر میری بچیوں کی فیس دوسرے بچوں کی نسبت ذرا کم ہی رکھنا، مہربانی ہوگی۔‘‘

انھوں نے اماں کا ہاتھ تھام کر اِلتجا کی تھی۔ اماں انھیں تسلی دیتے ہوئے دروازے تک چھوڑنے چلی گئیں۔

......☆......

ہفتے کی صبح ابھی میں نماز کے بعد تلاوتِ قرآن پاک میں ہی مصروف تھی کہ کِھلے کِھلے رنگوں میں ملبوس تر و تازہ صورت والی بشریٰ آن وارد ہوئی۔ اسے انٹرویو لینے کی کچھ زیادہ ہی جلدی تھی، حالاں کہ وقت نو بجے کا مقرر ہوا تھا۔ میں نے معمول کے مطابق تلاوت مکمل کی، پھر ناشتا بنانے کے لیے باورچی خانے کی طرف چل دی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے اور اماں نے بھی اچھے لباس زیب تن کیے، پھر میانہ روی سے زینے کی طرف بڑھے، تاکہ العمر سائنس ہائی اسکول کا تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لے سکیں۔

کمرے اسکول کے ماحول کے مطابق میں بشریٰ کے ساتھ مل کر کل شام کو ہی تیار کر چکی تھی، یعنی دونوں کمروں میں ایک ایک چٹائی بچھا کر اُس کے سامنے استانیوں کے لیے دو، دو کرسیاں رکھ دی گئی تھیں۔ بشریٰ کا خیال تھا کہ بچے ہماری غیر موجودگی میں کرسیوں پر بیٹھ جایا کریں گے، اس لیے ایک تنبیہی تحریر ہم نے کرسیوں کے بالکل اوپر دِیوار پر آویزاں کر دی، جس پر بشریٰ نے اپنی بچکانہ لکھائی میں یہ الفاظ درج کیے تھے:

’’خبردار! استانیوں کی کرسیوں پر بیٹھنے والے بچے امتحان میں ہمیشہ فیل ہو جاتے ہیں۔‘‘

اس کے علاوہ کچھ لال پیلے رنگوں کے پرچوں میں ہم نے نصیحتیں لکھ کر دِیواروں پر چسپاں کر دیے تھے۔ مثلاً: آپس میں پیار محبت سے رہیں، بڑوں کی بات توجہ سے سنیں، روزانہ سبق یاد کر کے آیا کریں، پانی بیٹھ کر پییں اور اُستانیوں کا ہمیشہ ادب کریں، وغیرہ۔

آخری جملے پر اماں سخت معترض ہوئیں کہ یوں بچے صرف استانیوں کا ادب اور میری بے ادبی کر جایا کریں گے، جس پر بشریٰ نے ان کی تسلی کے لیے آگے یہ الفاظ درج کر دیے:

’’اور اُستانیوں کی ماؤں کا بھی ادب کریں۔‘‘

اسکول کے جائزے کے دوران میں ہی بچوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نیلے، گلابی رنگوں والے بستے کندھوں پر لٹکائے تقریباً بارہ سے تیرہ بچے ماؤں کے ہم راہ اِنٹرویو کے لیے حاضر ہو چکے تھے۔ ہم نے خواتین کی سادے پانی سے تواضع کے بعد اپنی نشستیں سنبھالیں اور کچھ ہی دیر میں باوقار انداز میں بچوں کے انٹرویو کا سلسلہ شروع کر دیا۔

سب سے پہلے خالہ مریم کی اکلوتی بیٹی کی باری آئی۔ انٹرویو بشریٰ کر رہی تھی۔ بچی پورے اعتماد سے سوالوں کے جواب دینے لگی۔

’’جی تو آپ کی تعلیم کتنی ہے؟‘‘

’’میم! میں لیول ون کے ایگزام کلیئر کر چکی ہوں۔‘‘

’’گڈ! تو پھر اُس سکول کو چھوڑنے کی وجہ کیا بنی؟‘‘

’’میم! لیول ٹو میں فیس ففٹین ہنڈرڈ بڑھا دی گئی تھی، جو میرے فادر پے نہیں کر سکتے تھے۔‘‘

بشریٰ نے میری طرف کھسک کر سرگوشی کی:

’’یہ بچے ہمیں ناکوں چنے چبوائیں گے، بہتر یہی ہے کہ ہم صاف الفاظ میں کہہ دیں کہ ہمارا مقصد ہے اردو کو فروغ دینا، انگریزی میں بات نہیں کی جائے گی۔‘‘

’’یہ بعد کی بات ہے، فی الحال انٹرویو پر توتوجہ دے لو۔‘‘

میں نے بظاہر مسکراتے ہوئے، مگر چبا چبا کر اُسے اس کے مرتبے کا لحاظ کروایا۔

’’ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ جلد ہی آپ کے نتائج نوٹس بورڈ (دروازے کے تختے) پر آویزاں کر دیے جائیں گے۔ اگلا آجائے۔‘‘

بشریٰ نے ایک ادا سے کہتے ہوئے رجسٹر پر قلم گھسیٹا۔ اگلا اِنٹرویو مجھے کرنا تھا، اس لیے چہرے پر خوب صورت سی مسکان سجا کر آسیہ خالہ کی بیٹی کو سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ان کی باچھیں خواہ مخواہ پھیلی جارہی تھیں۔ شاید نہیں، یقیناً یہ بات ان کے لیے خوش کن تھی کہ ان کی بیٹی انٹرویو کے لیے بلائی جاچکی ہے۔

ماہ نور نہایت بے تکے انداز میں سوالوں کے جواب دینے لگی۔ مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی۔

’’جی تو ماہ نور! پہلے کس جماعت میں پڑھتی تھیں آپ!؟‘‘

’’پہلے میں اسکول نہیں جاتی تھی، بہت پہلے جب جاتی تھی تو بختاور اور صدف بھی ساتھ جاتی تھیں۔‘‘

’’جب بہت پہلے اسکول جاتی تھیں تو کس جماعت میں پڑھتی تھیں؟‘‘

’’دوسری یا چوتھی میں پڑھتی تھی، بھول گئی ہوں۔‘‘

ماہ نور نے معصومیت کا اظہار کیا۔ میں نے بمشکل غصہ ضبط کرتے ہوئے خالہ کی سمت وضاحت طلب نگاہوں سے دیکھا تو وہ ایک دم شروع ہوگئیں:

’’پہلی دفعہ ہے نا! اس لیے بچی گھبرا گئی ہے، ورنہ تو اُمیروں کے بچے ہی انٹرویو دیتے تھے۔ پہلے نا یہ ’’ماسٹرز اِن‘‘ میں پڑھنے جاتی تھی۔‘‘

پھر اُنھوں نے بیٹی کی طرف رخ موڑ کر کہا:

’’استانی کو بتاؤ بیٹا! وہاں کس جماعت میں پڑھتی تھیں؟‘‘

’’بھول گئی ہوں اماں!‘‘

’’کمال ہے! آپ کی بچی کس جماعت میں پڑھتی تھی، آپ اتنی بات بھی نہیں جانتیں!؟‘‘

بشریٰ طنز کیے بنا نہ رہ سکی۔

’’جی بشریٰ باجی! وہ تو میں گھر کے کاموں میں اتنا مصروف رہتی تھی کہ کبھی پوچھنے کی نوبت ہی نہ آئی، بس اتنی تسلی تھی کہ پڑھائی اچھی ہو رہی ہے۔‘‘

آسیہ خالہ نے شرمندگی سے وضاحت دی۔ اماں نے بھی بے ساختہ سوال اٹھایا:

’’یہ بات آپ کو کیسے معلوم ہوگئی کہ وہاں پڑھائی اچھی ہو رہی ہے؟‘‘

’’وہ جی، ڈنڈے وغیرہ مارتے رہتے تھے اسکول والے، کبھی کرسی پر ہاتھ اوپر کر کے کھڑا بھی کر دیتے تھے، بس اسی سے مجھے اندازہ ہوگیا۔‘‘

’’واہ!‘‘

اماں کے منہ سے پھسلا۔ بشریٰ نے معاملے کو طول پکڑتے دیکھ کر فوراً مداخلت کی:

’’چلیں، ٹھیک ہے۔ بہت جلد ہم نتائج کا اعلان کر دیں گے۔ امید ہے آپ کی اس بیٹی کو پہلی یا دُوسری جماعت میں داخلہ مل ہی جائے گا۔‘‘

’’ارے یہ تو زیادتی ہو جائے گی میری بچی کے ساتھ، آپ ایسا کریں کہ اسے چھٹی جماعت میں داخلہ دے دیں، یہ بہت ذہین ہے۔‘‘

’’آسیہ خالہ کی جانب سے مشورہ آیا تو بشریٰ نے ناگواری سے رخ پھیر لیا، جب کہ میں نے بروقت خوش اخلاقی کا دَامن تھاما:

’’جی ضرور، ہم غور کریں گے اس پر۔‘‘

’’مہربانی، مہربانی!‘‘

اگلا بچہ اپنے نقوش سے ہی پڑھا کو لگ رہا تھا، بشریٰ نے میری طرف جھک کر سرگوشی کی:

''مجھے لگتا ہے اسے تیسری میں بٹھا دینا چاہیے۔''

''انٹرویو سے پہلے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔''

میں نے بچے کو دیکھتے ہوئے جواب دیا، جو بمشکل سات یا آٹھ سال کا لگ رہا تھا۔

بشریٰ نے بسم اللہ کرتے ہوئے سوالات کی بوچھاڑ کر دی، بچہ جو منہ میں آیا جواباً عرض کرتا گیا۔ وہ دوسری جماعت میں داخلے کا خواہش مند تھا، البتہ بشریٰ نے زبردستی اس کا نام تیسری جماعت میں لکھ دیا۔ اب میری باری تھی اور میرے سامنے چودہ یا پندرہ سالہ لڑکی بیٹھی تھی۔ میرے سوال سے پہلے ہی اس نے کہنا شروع کر دیا:

''مس! میرا نام عنایہ بتول ہے، ساتویں جماعت میں دو مرتبہ فیل ہونے کی وجہ سے میری امی نے سزا کے طور پر مجھے گھر بٹھا لیا ہے۔''

میں نے بشریٰ کی سمت کن اکھیوں سے دیکھا، جہاں چہرے کی رنگت اڑی اڑی دکھائی دے رہی تھی، وہ شرربار نگاہوں سے عنایہ کو گھورنے لگی، جو اپنے تعارف میں مزید کہہ رہی تھی:

''میں آگے پڑھنا چاہتی تھی، مگر میری امی کہتی ہیں کہ تم پڑھتی تو ہو نہیں، بس پیسا ہی ضائع کر رہی ہو۔ اب جیسے ہی آپ کے اسکول کھولنے کا پتا چلا تو میں نے امی کی بہت منتیں کیں کہ مجھے بھی داخلہ دلوا دیں، وہ بمشکل راضی ہوئی ہیں اور یہ بھی کہا ہے کہ اگر میں دوبارہ فیل ہوگئی تو وہ مجھے دوبارہ اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھنے دیں گی۔''

اپنی دکھ بھری داستان سنا کر وہ رحم طلب نظروں سے مجھے اور بشریٰ کو دیکھنے لگی تبھی اماں کی آواز اُبھری:

''اے بی بی! پرائیویٹ اسکول والے بچوں کو کہاں فیل کرتے ہیں؟''

''نہیں اماں! وہ تو......''

''اماں!؟''

وہ غضب ناک ہو اُٹھیں۔ عنایہ کی بات درمیان ہی رہ گئی تھی۔ اس نے فوراً معذرت کی:

''سوری مادام!''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔''

اماں نے اطمینان سے کرسی سے پشت ٹکالی۔ تین چار بچوں کے انٹرویو نے ہی مجھے بُری طرح تھکا ڈالا تھا، بشریٰ بھی کئی بار چائے کے وقفے کا نعرہ لگا چکی تھی۔ آخر چند رسمی سوالوں کے بعد جلدی جلدی باقی ماندہ بچوں کا بے تکے انداز میں انٹرویو لیا گیا اور جھٹ سے کھڑے ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی بشریٰ نے دستے کا صفحہ پھاڑ کر گوند کی مدد سے دروازے پر چپکا دیا۔

......(جاری ہے)......

سوال آدھا، جواب آدھا (77) کے درست جوابات

1۔ 2 (پارہ نمبر 14 اور پارہ نمبر 29)۔

2۔ سورۃ بقرہ (آیت نمبر 43)۔

3۔ حضرت داؤد علیہ السلام۔ 4۔ 1030ء۔

5۔ علاؤ الدین خلجی (اس نے خطبوں کے دوران میں اپنے آپ کو ''سکندر ثانی'' کہلوایا۔ اس کے دورِ حکومت میں جاری ہونے والے سکّوں پر بھی ''سکندر ثانی'' کندہ تھا)۔

6۔ 25 جون 1958ء۔ 7۔ بلجیم۔

8۔ ڈپٹی کمشنر (Deputy Commissioner)۔

9۔ جس ملک میں رہنے کا اتفاق ہو اس کے طور طریقوں کی پابندی کرنا پڑتی ہے۔

ذوقِ معلومات (۱۲۱) کا درست جواب

☆ ڈپٹی مولوی نذیر احمد

رنگوں کی پہیلی کا درست جواب

☆C

چٹ کی آواز

محمد علی ادیب۔ اسلام آباد

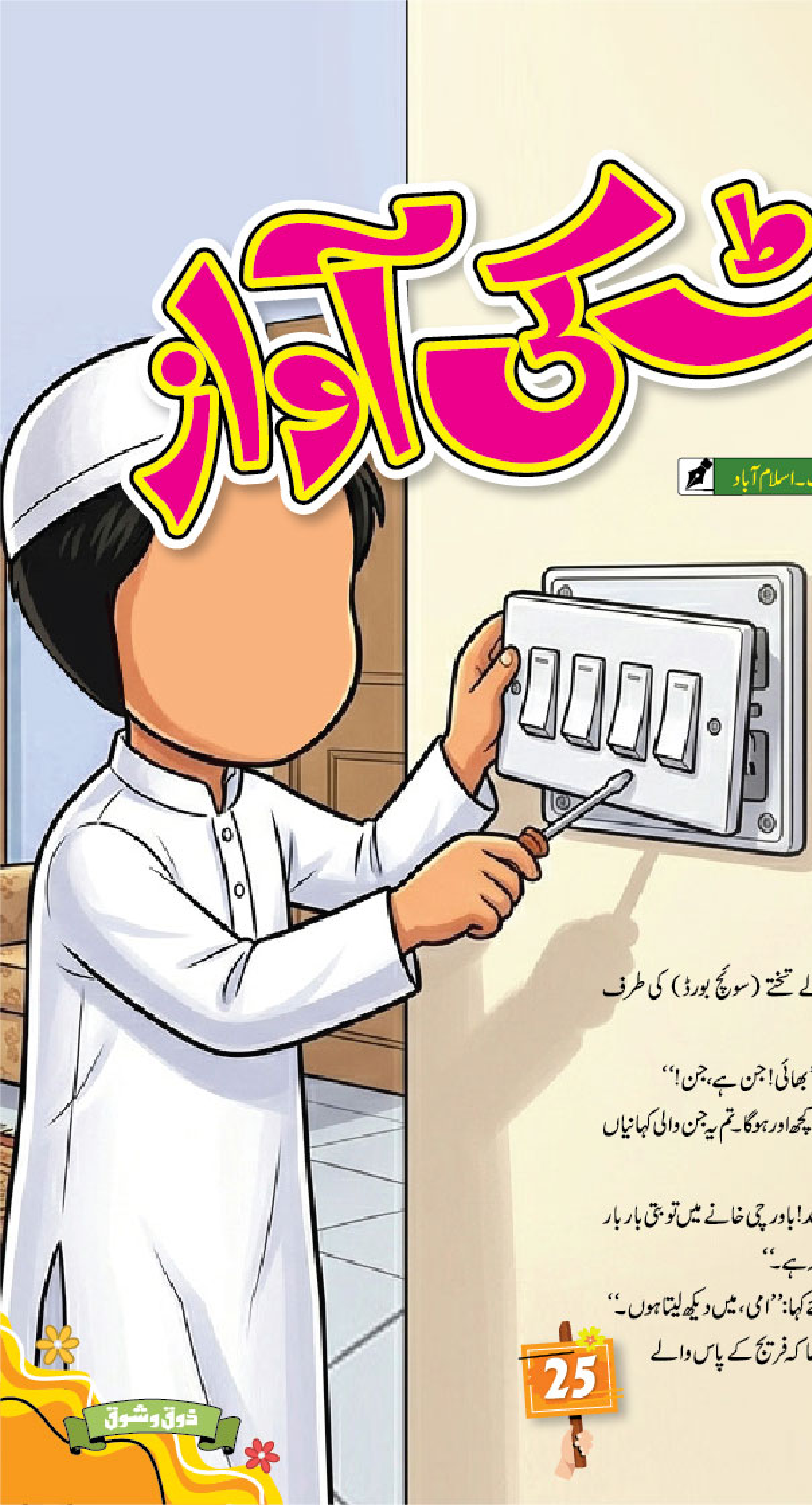

اتوار کی دوپہر تھی۔ بارش کے بعد کی نمی ابھی تک دیواروں میں موجود تھی۔ سعد نے کمرے میں پنکھا چلایا تو عجیب سی ”چٹ“ کی آواز آئی، پھر ایک لمحے کے لیے بتی ہلکی ہوئی اور پھر ٹھیک ہوگئی۔

سعد نے چونک کر کھٹکوں والے تختے (سوئچ بورڈ) کی طرف دیکھا۔ ”یہ کیا تھا؟“

اس کی چھوٹی بہن حرا فوراً بولی: ”بھائی! جن ہے، جن!“

سعد نے ہنس کر کہا: ”جن نہیں، کچھ اور ہوگا۔ تم یہ جن والی کہانیاں پڑھنا چھوڑ دو۔“

اسی وقت امی کی آواز آئی: ”سعد! باورچی خانے میں تو بتی بار بار مدھم ہو رہی ہے۔ دیکھنا ذرا، کیا مسئلہ ہے۔“

سعد نے خود کو بڑا ماہر سمجھتے ہوئے کہا: ”امی، میں دیکھ لیتا ہوں۔“

وہ باورچی خانے میں گیا تو دیکھا کہ فریج کے پاس والے

کھٹکوں کے تختے سے ہلکی ہلکی چٹ، چٹ کی آواز آ رہی تھی اور ہلکی سی جلے ہوئے پلاسٹک کی بُو بھی آ رہی تھی۔ سعد نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

حرا بھی پیچھے پیچھے آ گئی۔ ''بھائی! بُو کیوں آ رہی ہے؟''

سعد نے بغیر سوچے کہا: ''شاید فریج زیادہ گرم ہو گیا ہے۔''

اس نے کھٹکا کھول بند کیا۔ دوبارہ وہی ''چٹ'' کی آواز آئی۔ حرا نے ڈر کر سعد کی قمیص پکڑ لی۔ ''بھائی! بند کر دو۔''

سعد نے فیصلہ کیا کہ وہ تار نکال کر دیکھے گا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ابو باہر سے آ گئے۔ ابو نے سعد کا ہاتھ پکڑ لیا: ''رکو، تار مت نکالو۔''

سعد نے حیرت سے پوچھا: ''کیوں ابو!؟''

ابو نے سنجیدگی سے کہا: ''جب کھٹکوں کا تختہ گرم ہو، بُو آ رہی ہو، یا چٹ، چٹ ہو رہی ہو تو اِس کا مطلب ہو سکتا ہے کہ اندر جوڑ ڈِھیلا ہے یا دَباؤ زِیادہ ہے۔ ایسے وقت میں تار کو ہاتھ لگانا خطرناک ہو سکتا ہے۔''

سعد نے شرمندہ ہو کر کہا: ''میں تو بس دیکھ رہا تھا۔''

ابو نے نرمی سے کہا: ''دیکھنا ٹھیک ہے، مگر طریقہ ٹھیک ہونا چاہیے۔ سب سے پہلے اپنی حفاظت کرنی ہے۔''

ابو نے پہلے بنیادی کھٹکا (مین سوئچ) بند کیا، پھر ایک ٹارچ لے کر کھٹکوں والے تختے کے پاس آ گئے۔ سعد اور حرا بھی پاس بیٹھ گئے، جیسے کوئی انوکھا کام دیکھ رہے ہوں۔

ابو نے کہا: ''سعد! تم سائنس پڑھتے ہو نا! آج گھر میں سائنسی تجربہ دیکھو گے۔''

سعد کی آنکھیں چمکیں۔ گھر میں سائنس، ویسے بھی سائنس، سعد کا پسندیدہ مضمون تھا۔

ابو نے سوال کیا: ''تمھیں پتا ہے کہ اضافی دباؤ کیا ہوتا ہے؟''

سعد نے سوچ کر کہا: ''جب زیادہ چیزیں جوڑ دیں۔''

ابو نے کہا: ''بالکل! جب ایک ہی جگہ میں بہت زیادہ طاقت والے آلات لگ جائیں تو تار سے زیادہ کرنٹ گزرتا ہے اور گرمائش بڑھتی ہے۔ گرمائش بڑھے تو پلاسٹک پگھل سکتا ہے، اور پھر بجلی کا جھٹکا (شارٹ سرکٹ) یا آگ لگنے کا خطرہ ہو سکتا ہے۔

حرا نے فوراً کہا: ''آگ؟!''

امی بھی آ گئیں: ''اللہ خیر! پھر کیا کریں؟''

ابو نے تختے کے پاس لگا ایک ''ملٹی پلگ'' دکھایا، جس میں فریج، مائیکرو ویو، برقی کیتلی اور چارجر، سب ایک ساتھ لگے ہوئے تھے۔

ابو نے سعد سے کہا: ''ذرا سوچو، یہاں مسئلہ کیا ہے؟''

سعد نے ''ملٹی پلگ'' دیکھا اور آہستہ سے کہا: ''ہم نے بہت کچھ ایک ساتھ لگا رکھا ہے۔''

ابو نے کہا: ''یہ پہلا معما حل ہوا۔''

سعد نے پوچھا: ''لیکن 'چٹ' کی آواز کیوں آتی ہے؟''

ابو نے کہا: ''ڈھیلا جوڑ ہو تو بجلی کے رابطے میں بار بار خلا بنتا ہے، جس کی وجہ سے چھوٹی سی چنگاری نما اثر ہوتا ہے۔ اسی سے آواز بھی آ سکتی ہے اور گرمی بھی بڑھتی ہے۔''

سعد نے جھک کر دیکھا۔ کھٹکوں کے تختے کے کنارے پر ایک جگہ ہلکی سی سیاہی تھی، جیسے جلنے کا نشان ہو۔

ابو نے کہا: ''یہ نشان بتا رہا ہے کہ یہاں دباؤ زیادہ پڑا ہے۔ اب ہم کیا کریں گے؟''

سعد نے فوراً کہا: ''سب چیزیں نکال دیں گے۔''

ابو نے کہا: ''بالکل ٹھیک!''

سعد کو یاد آیا: ''اپنی حفاظت سب سے پہلے کرنی ہے۔ سب سے پہلے بنیادی کھٹکا بند کرنا ہے!''

ابو نے مسکرا کر کہا: ''شاباش!''

انھوں نے ساری چیزیں نکالیں۔ ابو نے کہا: ''فریج کو الگ لگاؤ۔ برقی کیتلی اور مائیکرو ویو کو ایک ساتھ مت لگانا۔ اور یہ سستا ملٹی پلگ ہے، اسے بدلنا پڑے گا۔''

امی نے فکرمندی سے کہا: ''لیکن سعد نے تو ہاتھ لگانے کی کوشش کی تھی۔ اگر لگا لیتا؟''

ابو نے سعد کو دیکھ کر کہا: ''اسی لیے میں نے روکا۔ کبھی کبھی بلا سوچے سمجھے بہادری کی کوشش نقصان دے سکتی ہے۔ اصل ہوش یاری یہ ہے کہ خطرے کو پہچانو اور صحیح طریقے سے کام کرو۔''

یہ بات سعد کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ خود کو بہت سمجھ دار سمجھتا تھا، لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ بجلی کے ساتھ سی چھوٹی غلطی کتنی بڑی بن سکتی ہے۔

ابو نے کہا: ''سعد! طبیعیات (فزکس) میں تم نے برقی رو کی رکاوٹ کے بارے میں پڑھا ہوگا؟''

سعد نے کہا: ''جی، ''اوہم'' (Ohm) کا قانون بھی پڑھا ہے۔''

ابو نے کہا: ''جو تار گرم ہو رہا ہے نا، یہ بھی اسی سے جڑا ہے۔ جب برقی روزیادہ اور تار کی مزاحمت کم ہو تو گرمی بڑھتی ہے۔ اسی لیے صحیح موٹائی کے تار اور اچھا کھٹکا ضروری ہے۔''

حرا نے معصومیت سے پوچھا: ''ابو! بجلی نظر کیوں نہیں آتی؟ اگر نظر آتی تو ہم بچ جاتے!''

ابو ہنس دیے: ''اسی لیے ہم بجلی کو قوانین سے پہچانتے ہیں: بو، گرمی، آواز، چمک، بار بار کھل بند ہونا، یہ سب اس کی علامت ہیں۔''

اتنے میں بتی دوبارہ ہلکی ہوئی۔ امی گھبرا گئیں۔ ابو نے فوراً کہا: ''بنیادی کھٹکا تو بند ہے، پھر یہ کیسے ہوا؟'' پھر اُنھیں یاد آیا کہ اس بتی کا تعلق الگ ہے۔ وہ باہر میٹر کے پاس گئے اور دیکھا کہ ایک ایم سی بی (MCB) آدھے بند ہونے کی حالت میں ہے۔

ابو نے سعد کو بلایا۔ ''دیکھو، یہ ''بریکر'' کیوں بند ہوتا ہے؟''

سعد نے سوچ کر کہا: ''جب زیادہ دباؤ ہو یا برقی رو میں گڑبڑ ہو؟''

ابو نے کہا: ''بالکل! بریکر دراصل حفاظتی دربان ہے۔ یہ جان بوجھ کر بند ہوتا ہے، تاکہ آگ نہ لگے۔ کچھ لوگ اسے بار بار کھول دیتے ہیں بغیر وجہ دیکھے، ایسا کرنا خطرناک ہے۔''

سعد نے سر ہلا دیا۔ ''ہم نے بھی پہلے بس کھٹکا کھول بند کیا تھا۔''

ابو نے کہا: ''ہاں، تم نے غلطی کی، لیکن سیکھ لیا۔ یہی اصل بات ہے۔''

شام کو ابو بجلی کے کام کے ماہر کو لے آئے۔ اس نے کھٹکوں کا تختہ کھولا تو اندر ایک تار کا جوڑ واقعی ڈھیلا تھا۔ پلاسٹک بھی تھوڑا سا پگھلا ہوا تھا۔

بجلی کے ماہر نے کہا: ''یہ وقت پر پکڑ لیا، ورنہ بڑا مسئلہ ہو سکتا تھا۔''

سب نے سکھ کا سانس لیا اور الحمدللہ! کہا۔

سعد نے شرمندگی سے کہا: ''یہ سب میری وجہ سے تو نہیں ہوا؟''

بجلی کے ماہر نے کہا: ''بیٹا! یہ زیادہ تر اضافی بوجھ اور کم معیار والے ملٹی پلگ سے ہوتا ہے، لیکن ہاں، اگر بروقت پتا چل جائے تو بچاؤ ہو جاتا ہے۔''

ابو نے گھر والوں کو اکٹھا کیا اور کہا: ''یہ بات یاد کرلو کہ باورچی خانے کے کھٹکوں میں تمام زیادہ بجلی استعمال کرنے والے آلات الگ الگ لگیں گے، اور ملٹی پلگ صرف کم طاقت والی چیزوں کے لیے استعمال ہوگا۔''

حرا نے ہاتھ اٹھایا: ''اور چارجر؟''

ابو نے کہا: ''چارجر ٹھیک ہے، مگر گیلا ہاتھ، گیلی جگہ یا ٹوٹے ہوئے تار کو اِستعمال کرنے سے بچنا ہے۔''

رات کو سعد، دادی کے پاس بیٹھا تو دادی نے پوچھا: ''آج بہت سنجیدہ لگ رہے ہو؟''

سعد نے کہا: ''دادی، میں سمجھتا تھا میں سب کچھ کر سکتا ہوں، لیکن آج پتا چلا کہ سمجھ داری کا مطلب یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی خود کچھ نہ کرو۔''

دادی نے مسکرا کر کہا: ''ہاں بیٹا! جس کام ہو اُسے ہی کرنا چاہیے۔''

برف

اسکول میں اسمبلی کے بعد تمام بچے کمرۂ جماعت میں پہنچ ہو چکے تھے۔

استاد محترم صابر صاحب کمرۂ جماعت میں تشریف لائے اور مسکرا کر سلام کیا:

’’السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، صبح بخیر بچو!‘‘

’’وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! صبح بخیر اُستاد جی!‘‘

سب بچوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

صابر صاحب نے پوچھا:

''اتوار کا چھٹی کا دِن کیسا گزرا آپ سب کا؟''

علی نے خوشی سے بتایا:

''بہت ہی اچھا گزرا اُستاد جی! کل ہم نے برف کے گولے بنائے تھے اور برف کا ایک آدمی بھی بنایا تھا۔''

صابر صاحب ہنستے ہوئے بولے:

''تو گویا آپ سب نے اتوار کو خوب مزے کیے ہیں!''

''جی ہاں، ہمیں بہت مزہ آیا!'' بچوں نے خوش ہو کر جواب دیا۔

صابر صاحب نے کمرۂ جماعت میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا:

''میں دیکھ رہا ہوں کہ آج چند بچے نظر نہیں آ رہے۔''

حسن نے جواب دیا:

''جی استاد جی! سلیم اور عامر آج اسکول نہیں آئے۔''

''مگر کیوں؟'' صابر صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔

ساجد بولا:

''وہ بیمار ہو گئے ہیں۔ دوائیں لی ہیں، وہ گھر پر ہی ہیں۔''

صابر صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے بچوں کو دیکھا اور کہا:

''میرا خیال ہے، انھوں نے برف میں کافی دیر کھیل کر اپنا نقصان کر لیا ہے۔''

بچے یہ سن کر پریشان ہوئے۔ ساجد نے پریشانی سے پوچھا:

''استاد جی! ہم بھی تو برف میں کھیلتے رہے ہیں، کیا ہم بھی بیمار ہو جائیں گے؟''

صابر صاحب نے نرمی سے سمجھایا:

''اگر آپ احتیاط نہ کریں اور زِیادہ دیر تک برف میں کھیلتے رہیں تو بیمار ہونے کا خطرہ ضرور ہوتا ہے۔''

احمد نے معصومیت سے پوچھا:

''لیکن استاد جی! آخر برف میں کھیلنے سے بیماری کیوں ہوتی ہے؟ برف تو ہمیں بہت اچھی لگتی ہے۔''

صابر صاحب نے سمجھاتے ہوئے کہا:

''دراصل، جب ہم ٹھنڈی جگہ پر زیادہ دیر تک رہتے ہیں تو ہمارے جسم میں ایسے چھوٹے چھوٹے جراثیم داخل ہو جاتے ہیں جو ہمیں دکھائی نہیں دیتے۔ یہ جراثیم ہمارے جسم کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔''

عثمان نے پوچھا:

''کیا جراثیم کے داخل ہونے سے ہم فوراً بیمار ہو جاتے ہیں؟''

صابر صاحب نے ہنستے ہوئے جواب دیا:

''نہیں بچو! ہر مرتبہ ایسا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے جسم میں ایک خاص بچانے والا نظام بنایا

ہے، جو بالکل فوج کی طرح ہوتا ہے۔ یہ فوج ہمیں جراثیم اور بیماریوں سے بچاتی ہے۔''

حسن نے تجسس سے پوچھا:

''تو پھر ہم بیمار کیوں ہوتے ہیں؟ کیا یہ نظام کمزور ہو جاتا ہے؟''

یہ سن کر صابر صاحب نے وضاحت کی:

''نہیں، ایک عام صحت مند اِنسان کا یہ بچانے والا نظام صحیح کام کرتا ہے، لیکن جب ہم اپنا خیال نہیں رکھتے، زیادہ دیر سردی میں رہتے ہیں یا کھانے پینے میں لاپروائی کرتے ہیں تو ہمارا جسم کمزور ہو جاتا ہے اور جراثیم زیادہ آسانی سے حملہ کر لیتے ہیں۔''

ساجد نے پوچھا:

''کیا پھر جراثیم فوراً پورے جسم میں پھیل جاتے ہیں؟''

صابر صاحب نے سر ہلاتے ہوئے کہا:

''نہیں، بل کہ ہمارا بچاؤ کا نظام ان کے خلاف جنگ شروع کر دیتا ہے۔ اسی جنگ کے دوران میں ہمیں بخار ہو جاتا ہے، بدن میں درد ہوتا ہے اور ہم کمزوری محسوس کرتے ہیں۔''

علی نے پوچھا:

''پھر ایسے وقت میں ہمیں آرام کرنا چاہیے؟''

صابر صاحب نے مسکرا کر جواب دیا:

''بالکل! آرام کرنا، دوائی لینا اور اچھا کھانا بہت ضروری ہے۔ اس طرح ہمارا جسم طاقت وَر ہو جاتا ہے اور جراثیم کو جلدی ختم کر دیتا ہے، پھر ہم دوبارہ صحت مند ہو جاتے ہیں۔''

بچوں نے خوش ہو کر کہا:

''اب ہمیں معلوم ہو گیا کہ ہمیں اپنی صحت کا خیال کیسے رکھنا چاہیے۔ ہم اب پہلے سے زیادہ احتیاط کریں گے۔''

صابر صاحب نے محبت سے کہا:

''یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے کہ اُس نے ہمارے جسم کو بیماریوں سے لڑنے کی طاقت دی ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کا شکر اَدا کرنا چاہیے اور اپنی صحت کی حفاظت کرنی چاہیے۔''

اسی گفتگو میں دورانیہ ختم ہو گیا اور صابر صاحب بچوں کو سلام کر کے کمرۂ جماعت سے چلے گئے۔

آؤ رنگ بھریں

پیارے بچو! رنگ بھر کر اپنے
والدین کو بھی دکھایئے۔

گھومتا مکعب

اسد اشفاق۔ کراچی

پیارے بچو!

کیا آپ کی نظر تیز ہے؟ کیا آپ رنگوں اور شکلوں کو غور سے دیکھ سکتے ہیں؟ تو پھر یہ دل چسپ منطقی کھیل آپ ہی کے لیے ہے!

تصویر میں خاص نقوش والا ایک بڑا مکعب (Cube) دیا گیا ہے۔ بائیں طرف اس جیسے 9 مکعب موجود ہیں، مگر اُن میں سے صرف ایک مکعب اس بڑے مکعب سے ملتا ہے۔

اب آپ کو اپنی عقل، توجہ اور مشاہدے کی طاقت کا استعمال کر کے یہ معلوم کرنا ہے کہ کون سا مکعب اس بڑے مکعب جیسا ہے۔

جلدی جواب دینے کے بجائے غور سے دیکھیں:

☆ سب سے پہلے اصل مکعب کے رنگ اور نشانات دیکھیں۔

☆ دیکھیں کون سی شکل کس شکل کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔

☆ اوپر، دائیں اور بائیں جانب والے خانوں کی ترتیب یاد رکھیں۔

☆ خیال رہے، مکعب کو تصور میں گھمایا بھی جا سکتا ہے۔

یاد رہے، صرف رنگ ایک جیسے ہونا کافی نہیں، شکلوں کی سمت اور ترتیب بھی درست ہونی چاہیے۔ اب آپ اپنی عقل آزمایئے......

کوپن بھر کر آپ جواب اور کوپن واٹس اَپ بھی کر سکتے ہیں، لیکن کوپن قلم سے بھریے گا، پنسل سے نہیں۔

جواب بھیجنے کی آخری تاریخ 31 جولائی 2026 ہے۔

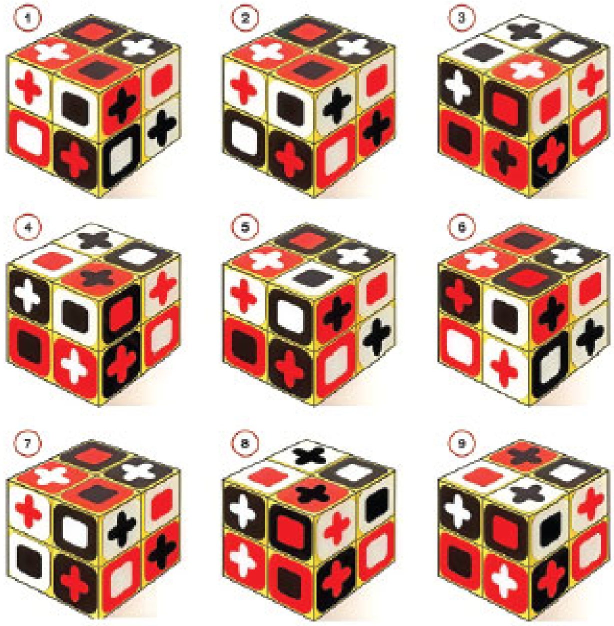

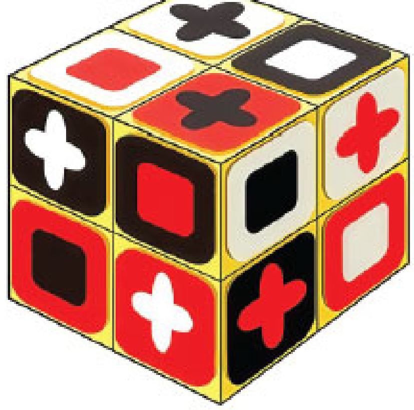

چھوٹی سی تتلی

محمد ایوب اختر۔ لیاقت پور

چھوٹی سی تتلی
پھولوں سے نکلی
تیزی سے بڑھ کر
بچوں نے پکڑی

رنگ اس کے سارے
خاصے نیارے
لگتے بہت تھے
آنکھوں کو پیارے

ننھا سا بچہ
من کا تھا سچا
کہتے تھے سب ہی
بچہ ہے اچھا

بچہ وہ بولا:
توڑیں ستم کیوں
ننھی سی جاں کو
چھوڑیں نہ ہم کیوں

کہہ کر یہ اس نے
اس کو اڑایا
ننھی سی جاں کو
اس نے بچایا

موٹی ناک

روبینہ عبدالقدیر۔ کراچی

ابو جان عنایا کے لیے بھالو لائے تھے۔ سفید رنگ کے بھالو کی موٹی سی لال رنگ کی ناک تھی۔ عنایا اس ناک کو دباتی تو بھالو کے اندر سے ہنسنے کی آواز آتی۔ اس کھیل میں عنایا کو بہت مزہ آرہا تھا۔ یہ نیا کھلونا اسے بہت پسند آیا تھا۔

اب بھالو جی ہر وقت عنایا کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ کھیلتے ہوئے، سوتے ہوئے، کھانا کھاتے ہوئے، حتیٰ کے بیت الخلا کے باہر بھی بھالو جی کو بٹھا دیا جاتا، چوکی دار بنا کر۔

امی جان بھی مطمئن تھیں کہ عنایا اب انھیں تنگ نہیں کرتی اور کھیلتی رہتی ہے۔

عنایا پانچ سال کی پیاری سی بچی تھی۔ وہ جب اپنی میٹھی میٹھی آواز میں پیاری پیاری باتیں کرتی تو سب کو اُس پر بہت پیار آتا تھا، لیکن جب وہ کسی بات کی ضد کرتی تو اُس پر اڑ جاتی اور اپنی امی جان اور ابو جان کو زِچ کر کے رکھ دیتی۔

عنایا کو کلمہ اور دُعائیں بھی یاد تھیں۔

وہ روزانہ اپنے ابو جان کو کلمہ سناتی، سوتے وقت کی دعا، کھانا کھاتے وقت کی دعا اور بیت الخلا جاتے وقت کی دعائیں تو اُسے ازبر تھیں۔

ایک دن بھالو کی ناک سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے جانے عنایا کے دل میں کیا سمائی،

سینے سے بھالو کو چمٹائے وہ امی جان کے پاس آگئی۔

''امی جان، امی جان!''

''جی بیٹا! کیا ہوا؟'' امی جان نے پیار سے پوچھا۔

''امی جان! مجھے بھی اس بھالو جیسی ناک چاہیے۔'' اس نے انوکھی فرمائش کرڈالی۔

''ارے! ایسی ناک؟ آپ کی تو اِتنی پیاری ناک ہے۔'' امی جان اس کی انوکھی فرمائش پر ہنس پڑیں۔

''نہیں، مجھے ایسی ناک چاہیے۔ میری ناک ایسی بنا دیں آپ پلیز۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

''بیٹا! آپ بھالو کی ناک سے کھیلو۔ دیکھو، اسے دباؤ۔'' وہ اس کا دھیان بٹانے لگیں۔

''نہیں، نہیں، مجھے ایسی ناک چاہیے، ایسی ہی چاہیے۔'' عنایا

اپنی ضد پر اَڑ گئی۔

امی جان کو اُس کی بات پر ہنسی بھی آ رہی تھی اور سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ اس کا دھیان کیسے ہٹائیں۔

''میری ناک تو چھوٹی سی ہے، گندی سی ہے۔ مجھے ایسی موٹی ناک چاہیے۔ پلیز امی جان! پلیز۔'' وہ منہ بسورے ایک ہی بات کہے جا رہی تھی۔

''دیکھو بیٹا! بھالو کی ناک موٹی ہے، اس ناک سے یہ سونگھ بھی نہیں سکتا، سانس بھی نہیں لے سکتا، نہ اسے خوش بُو کا پتا چلتا ہے نہ بد بو کا۔ آپ کی ناک تو اِتنی اچھی ہے کہ اس سے آپ سونگھ سکتی ہیں، سانس لے سکتی ہیں۔'' انھوں نے دلیل سے سمجھانے کی کوشش کی، لیکن بے سود رہی۔

رات ابو جان گھر آئے تو عنایا نے ان کے بھی سامنے یہی مدعا رکھا۔ ابو جان بھی ہنسنے لگے۔

انھوں نے سوال کیا:

''بیٹا! کیا آپ اپنی ناک سے تنگ ہیں؟''

''جی ابو جان!'' عنایا نے اثبات میں سر ہلایا۔

''آپ کو اپنی ناک اچھی نہیں لگتی؟ آپ کو بھالو جیسی ناک چاہیے؟''

''جی ابو جان!'' جواب وہی تھا۔

عنایا ابو جان کا بھی سر کھانے لگی اور ضد کرنے لگی۔

ابو جان نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی، لیکن اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

امی جان بھی اس کی اس نئی ضد پر کچھ پریشان تھیں۔

''چلو، ابھی آپ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ کر سو جائیں۔ صبح جب آپ اٹھیں گی تو آپ کی ناک بھالو جیسی ہوگی۔'' ابو جان نے اسے تسلی دی۔

امی جان نے دونوں باپ بیٹی کو خفگی بھری نظر سے دیکھا، لیکن وہ نہیں جانتی تھیں کہ ابو جان کے دماغ میں کیا چل رہا تھا، لیکن اتنا ہوا تھا کہ عنایا اب خاموش ہو گئی تھی۔

رات بھر عنایا اپنی بھالو جیسی ناک خواب میں دیکھتی رہی اور صبح اٹھتے ہی اسے یاد آیا کہ ابو جان نے کیا کہا تھا۔

وہ بھاگتے ہوئے شیشے کے سامنے گئی اور سچ میں اس کی ناک تو موٹی اور لال رنگ کی لگ رہی تھی۔ وہ خوشی سے کھل اٹھی۔

لیکن یہ کیا! ناک میں درد محسوس ہو رہا تھا اور کوئی خوش بُو وغیرہ بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ گھبرا گئی۔

''امی جان! مجھے درد ہو رہا ہے۔'' وہ رونے لگی۔

''بیٹا! آپ نے ہی تو اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ آپ کی ناک آپ کے بھالو جیسی ہو جائے۔ بھالو تو ناک سے سونگھ نہیں سکتا، سانس نہیں لے سکتا۔'' امی جان نے اس کی بات یاد کروائی۔

''اور آپ نے کہا تھا آپ کی ناک گندی ہے، آپ کو پسند نہیں ہے۔'' ابو جان نے یاد دِلایا۔

''نہیں، مجھے اپنی ناک واپس چاہیے۔ میری ناک کہاں ہے؟ میری ناک مجھے چاہیے۔ میری ناک اچھی تھی۔'' وہ ڈر کر روتے ہوئے بولی۔

''آئندہ آپ ضد کریں گی؟ روئیں گی؟'' ابو جان نے پوچھا۔

''نہیں ابو جان! آئندہ میں کبھی ضد نہیں کروں گی۔ میری ناک بہت اچھی تھی۔ مجھے میری ناک واپس چاہیے۔'' وہ فوراً بولی۔

''چلیں، آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ آپ کی ناک واپس کر دے۔'' انھوں نے دوبارہ اسے دعا مانگنے کا کہا۔

''اللہ تعالیٰ! میری ناک واپس کر دیں۔'' وہ اب بار بار یہی دعا کرنے لگی۔

وہ اداسی سے صحن میں رکھے تخت پر لیٹ گئی اور بار بار دُعا مانگنے لگی کہ اللہ تعالیٰ اس کی ناک واپس کر دیں۔

آخر کار اُسے رونا آ گیا۔

''اللہ جی پلیز! میری ناک پہلے جیسی کر دیجیے، میں اب ناشکری نہیں کروں گی۔ میری ناک بہت اچھی تھی، مجھے وہی ناک چاہیے۔'' وہ گڑگڑانے لگی۔

صفحہ نمبر 37 پر

دوست

احمد عدنان طارق۔ فیصل آباد

گرمیوں کی چھٹیوں میں زیرک اپنے والدین کے ہم راہ گاؤں رہنے آگیا۔ زیرک گاؤں میں خود کو اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ وہ پہلی دفعہ گاؤں میں کھیتوں میں بسے ہوئے اپنے گھر میں رہنے آیا تھا۔ ہر چیز اُسے اجنبی لگ رہی تھی، کیوں کہ وہ بہت سی چیزیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اسے وہاں اپنا کوئی ہم عمر نہیں ملا، جس سے وہ دوستی کر سکے اور اُس کے ساتھ کھیل سکے۔

ایک دن صبح سویرے وہ بیدار ہوا تو سورج چمک رہا تھا اور پرندے چہچہا رہے تھے۔ جب وہ گھر سے باہر نکلا تو صاف ہوا چل رہی تھی۔ کہیں گرد کا نام و نشان نہیں تھا۔ اسے بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا۔

تبھی زیرک کو گھوڑے کا ایک ننھا بچھیرا نظر آیا، جو گھاس چر رہا تھا۔ اس کی بھوری جلد سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ جب بچھیرے نے ننھے زیرک کو دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں اتنا پیار تھا کہ زیرک کو خیال آیا کہ اسے اس بچھیرے کو دوست بنا لینا چاہیے، لٰہذا زِیرک آگے بڑھ کر لکڑی کی بنی ہوئی باڑھ کے پاس گیا اور اُس کے اندر چرتے ہوئے بچھیرے کو پکار کر اپنی طرف متوجہ کیا۔

بچھیرا کیوں کہ گھوڑے کا ننھا بچہ تھا، اس نے سوچا کہ زیرک ضرور اُس کے کھانے کے لیے بھوسا یا کچھ اور لے کر آیا ہے۔ وہ دوڑتا ہوا زیرک کے پاس آیا اور باڑھ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے باڑھ نما جنگلے کے اوپر سے سر باہر نکالا۔ وہ بھوسے کا انتظار کر رہا تھا، لیکن زیرک کے پاس بچھیرے کو کھلانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ بچھیرے نے سوچا کہ زیرک نے اسے دھوکا دیا ہے۔ اس نے جنگلے سے اپنا خوب صورت سر پیچھے ہٹایا اور آہستہ آہستہ واپس جانے لگا۔

وہ واپس چلا گیا تو باڑھ کی دوسری طرف زیرک اکیلا کھڑا رہ گیا۔

زیرک نے سوچا:

’’یہ بچھیرا مجھے پسند نہیں کرتا۔‘‘ وہ بھی پیچھے مڑا اور واپس جانے لگا۔ اس نے کبھی خود کو اتنا اکیلا محسوس نہیں کیا تھا۔

اگلے دن زیرک پھر صبح سویرے اٹھ کھڑا ہوا۔ گاؤں کی صبح ہمیشہ کی طرح آج بھی نہایت اجلی تھی۔ اس کی امی جان نے اسے بہت مزے دار ناشتا بنا کر دیا۔ نیلے آسمان پر سورج چمک رہا تھا اور گاؤں بہت خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ آج وہ بچھیرے کو اپنا دوست بنا لے گا۔ زیرک نے سوچا:

’’میں آج دوبارہ کوشش کروں گا۔‘‘

وہ دوبارہ چراہ گاہ کی طرف گیا اور بچھیرے کو آواز دی۔ بچھیرے نے سوچا:

”یہ ننھا لڑکا ویسے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ امید ہے اس دفعہ مجھے دھوکا نہیں دے گا، اس لیے وہ دوبارہ دوڑتا ہوا باڑھ کے پاس آیا۔ وہ اپنی پتلی پتلی ٹانگوں سے بھاگتا ہوا بہت بھلا لگ رہا تھا، لیکن اس دفعہ بھی زیرک کے پاس بھوسا نہیں تھا۔

بچھیرے نے دوبارہ اپنا سَر جنگلے کے اندر کرلیا اور واپس مڑ کر چلنے لگا۔ اس کی دم مایوسی سے اِدھر اُدھر ہل رہی تھی۔ بچھیرا سوچ رہا تھا:

”ننھے لڑکے نے دوبارہ مجھے دھوکا دیا ہے۔ میں اس کا دوست نہیں بنوں گا۔“

جب زیرک نے دیکھا کہ ننھے بچھیرے نے دوبارہ منہ موڑ لیا ہے تو وہ بھی جنگلے سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بچھیرا اُسے پسند نہیں کرتا، حالاں کہ اب اس کی دلی خواہش تھی کہ کسی طرح بچھیرا اُس کا دوست بن جائے۔

اگلی صبح جب وہ ناشتا کر رہا تھا اس نے امی جان سے پوچھا:

”آپ اگر کسی کو جانتے نہ ہوں تو اُسے دوست کیسے بنا سکتے ہیں؟“ اس کی امی نے جواب دینے کی بجائے اس سے پوچھا:

”تم کسی کو دوست کیسے بنا سکتے ہو جب اسے جانتے ہی نہیں؟“

زیرک یہ سن کر سوچنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میں کیا کروں کہ بچھیرا مجھے جاننے لگے۔ اس نے امی جان سے پوچھا:

”بچھیرے کیا کھانا پسند کرتے ہیں؟“ یہ سن کر اُس کی امی جان مسکرا کر بولیں:

”گھوڑے بھوسا اور گاجریں کھانا پسند کرتے ہیں اور غلے کے گودام کے پیچھے بہت سا بھوسا موجود ہے۔“

زیرک نے جلدی جلدی نوالہ نگلا۔ دودھ کا آخری گھونٹ بھرا اور دوڑتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ اس نے دونوں بازوؤں میں بھوسا اٹھا لیا اور پھر دوڑتا ہوا چراگاہ کی طرف جانے لگا۔ چراگاہ کی باڑھ کے نزدیک جا کر اُس نے بچھیرے کو پکارا۔ جب بچھیرے نے اس کی آواز سنی، اس نے سر کو اُٹھایا اور سوچا:

”آج امید ہے کہ ہم دوست بن جائیں گے، کیوں کہ مجھے نہیں لگتا کہ وہ مجھے بھوسا کھلانے کے بہانے سے پکار رہا ہے۔“

وہ دوڑتا ہوا جنگلے کے پاس آ گیا۔ یہاں زیرک دونوں بازوؤں میں اسے کھلانے کے لیے بھوسا لیے کھڑا تھا۔ بچھیرے نے مزے لے لے کر بھوسا کھایا اور ایک تیلی تک نہیں چھوڑی۔ ہر لقمے کے ساتھ وہ اپنا سَر ہلاتا رہا، پھر اس نے اپنی ناک زیرک سے رگڑی اور اُس کا ہاتھ اپنی کھردری زبان سے چاٹا۔

کیوں کہ بچھیرے بات نہیں کر سکتے، اس لیے زیرک کو ابھی بھی یہ علم نہیں تھا کہ وہ پہلے دوست کیوں نہیں بن سکے۔ اس نے دونوں بازو بچھیرے کی گردن میں ڈال دیے اور پھر ہاتھوں سے اس کے سَر کو سہلانے لگا۔ اب کوئی شک باقی نہیں تھا کہ وہ دوست بن چکے تھے۔

بقیہ: موٹی ناک

اب تو اُسے بھالو پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ جس کی موٹی ناک کی وجہ سے اسے بھی موٹی ناک کی خواہش ہوگئی تھی۔ آخر کار وہ روتے روتے سوگئی۔

امی جان خاموشی سے اس کی حرکات کا جائزہ لے رہی تھیں اور دِل ہی دل میں مسکرا بھی رہی تھیں۔

جب وہ سو کر اُٹھی تو اُس کی ناک پہلے جیسی تھی۔ وہ اپنی پیاری چھوٹی سی ناک دیکھ کر مسکرا اُٹھی اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے لگی، کیوں کہ شکر اَدا کرنا بھی تو ضروری تھا۔

وہ بار بار اللہ کا شکر ادا کرتی کہ اس کی ناک ٹھیک ہوگئی۔

اب عنایا کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر عضو مکمل اور خاص بنایا ہے۔ جسم کا ہر حصہ زندگی کے لیے کتنا ضروری ہے اور آپ کو راز کی بات بتائیں۔

ابو جان نے اس کی ناک پر روئی رکھ کر لال رنگ کا اسٹیکر چپکا دیا تھا۔ آخر اُس کی ضد کا علاج بھی تو لازم تھا نا!

اس سب سے ابو جان کو بھی ایک بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ بچوں کے لیے شکلوں والے کھلونے نہیں لینے چاہییں۔

پھر کیا ہوا؟ 31

دو مددگار

نذیر انبالوی۔ لاہور

حارث، حمنہ اور حمزہ، دادی جان کے کمرے میں موجود تھے۔

دادی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا:

”آج کی کہانی میں نے اپنے ابو جان سے سنی تھی۔ اللہ تعالیٰ اُن پر اپنی رحمت فرمائیں۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو اُنھیں گردوں کے مرض میں مبتلا پایا۔ گاؤں کے حکیم صاحب سے علاج کروایا۔ جب افاقہ نہ ہوا تو میرے دادا جان انھیں شہر لے گئے۔ ایک جاننے والے کی مدد سے گردوں کے تجربہ کار ڈاکٹر توقیر سے وقت مل گیا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر توقیر کا بہت شہرہ تھا۔ وہ کچھ عرصہ قبل ہی بیرون ملک سے تربیت لے کر آئے تھے۔ وہ شہر میں دو جگہوں پر مریضوں کا معاینہ کرتے تھے۔ انھوں نے میرے ابو جان کا معاینہ کرنے کے بعد کچھ ادویات لکھیں اور پرہیز کرنے کا مشورہ دیا، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ابو جان کے مرض میں اضافہ ہوتا گیا۔ دادا جان اور دادی جان کو تشویش ہوئی، انھوں نے میرے تایا جان سے مشورہ کیا۔ وہ ان دنوں کراچی میں تھے۔ دادا جان کے بلانے پر وہ فوراً لاہور آگئے۔ اپنے چھوٹے بھائی کی حالت دیکھ کر تایا جان پریشان ہوگئے۔ میری عمر اُس وقت دس سال کے قریب تھی۔ دادی جان مجھے کہتیں کہ اپنے ابا جان کے لیے دعا کرو۔ میں دادی جان کی بات سن کر فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتی۔“ یہ کہتے ہوئے دادی جان کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔

”پھر کیا ہوا دادی جان!؟“ حمنہ نے سوال کیا۔

”تایا جان کے دوست اشرف کے والد، بلال صاحب ڈاکٹر تھے۔ تایا جان میرے ابو جان کی رپورٹیں لے کر ڈاکٹر بلال کے پاس گئے۔ انھوں نے رپورٹیں دیکھ کر کہا:

”خطرے والی کوئی بات نہیں، گردوں میں سوزش ہے، جس کے باعث درد ہے، میں دوا لکھ رہا ہوں، یہ دوا کھائیں، ان شاء اللہ بہت جلد افاقہ ہوجائے گا۔“

ڈاکٹر بلال کی دوا بھی بے اثر رہی۔ درد کے مارے ابو جان بے حال ہوجاتے تھے۔ گھر میں کسی سے ان کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ دوا بھی جاری تھی اور دُعاؤں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ابو جان کو کسی پل چین نصیب نہ تھا۔ ایک رات ایسا ہوا کہ......“ یہ کہتے ہوئے دادی جان کہیں کھو سی گئیں۔

”اس رات کیا ہوا تھا دادی جان!؟“ یہ آواز حمزہ کی تھی۔

”ابو جان کی حالت اس قدر خراب ہوئی کہ انھیں سول ہسپتال لے جانا پڑا۔ تایا جان، چچا جان ان کے ہم راہ تھے۔ فوری

نگہداشت والے کمرے میں ابتدائی معاینے کے بعد ابو جان کو گردہ وارڈ میں داخل کرلیا گیا۔ میں ہر لمحہ ان کے لیے دعا کررہی تھی۔ آخر اللہ تعالیٰ نے میری اور میرے گھر والوں کی دعا قبول کر لی۔ ابو جان پندرہ دن کے بعد گھر واپس آ گئے۔ انھیں دیکھ کر سب خوش ہو گئے تھے، سب نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ کچھ دنوں بعد ابو جان معمول کے مطابق اپنی دکان پر جانے لگے۔ وہ اکثر گھر میں ایک ناصر نامی ''وارڈ بوائے'' کا ذِکر کرتے تھے۔

انھوں نے بتایا کہ جب بھی موقع ملا میں ناصر کی کہانی آپ کو سناؤں گا۔ ابو جان رات گئے اپنی دکان سے واپس آتے تھے۔ ہم بہن بھائی انھیں اس لیے کہانی سنانے کے لیے نہیں کہتے تھے کہ وہ تھکے ہوتے تھے۔ میں انھیں یاد دِلاتی تھی کہ آپ کو کسی ناصر نامی شخص کی کہانی ہمیں سنانی ہے۔ وہ یہ سن کر فوراً کہتے:

''ہاں ہاں، کیوں نہیں، جیسے ہی موقع ملے گا میں وہ کہانی ضرور سناؤں گا۔''

دادی جان نے یہاں تک کہانی سنا کر بچوں پر نگاہ ڈالی۔ تینوں نہایت توجہ سے کہانی سن رہے تھے۔

''پھر کیا ہوا دادی جان!؟'' حارث نے سوال کیا۔

''پھر ایک دن موسم بہت خوش گوار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ابو جان مجھے اور میرے دو بھائیوں کو لے کر درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ ہم سمجھ گئے تھے کہ اب کہانی سننے کا وقت آ گیا ہے۔ انھوں نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''تو آج کی کہانی ایک ناصر کی کہانی ہے۔ ناصر کا مطلب ہوتا ہے مددگار، مدد کرنے والا، معاون۔ ناصر اپنے نام کی طرح اسم بامسمی تھا۔

''اسم بامسمی؟'' شہزاد بھیا نے دہرایا تو ابو جان بولے:

''جس کا نام اس کی صفات کے مطابق ہو، یعنی جیسا نام ویسا کام، ایسے شخص کو اِسم بامسمی کہتے ہیں۔''

''ناصر کا مطلب ہوتا ہے مدد کرنے والا تو ناصر واقعی دوسروں کی مدد کرتا ہوگا۔'' یہ آواز بڑے بھائی ظہیر کی تھی۔

''شاباش! بالکل ایسا ہی ہے، میں جس وارڈ میں داخل تھا، وہاں ناصر نام کا ایک نوجوان تھا۔ اس کی وارڈ میں ذمے داری صبح چھے بجے سے دوپہر دو بجے تک تھی۔ یوں تو وہاں ڈاکٹر اور نرسیں بھی موجود ہوتی تھی، مگر اُن کی موجودگی کے باوجود ناصر وارڈ کے ایک ایک مریض کے پاس جاتا اور کہتا کہ اگر کوئی کام ہے تو بتا دیجیے۔ وہ ایسا کسی لالچ میں نہیں کرتے تھا۔ دو بجے چھٹی کے بعد بھی وہ وہیں دکھائی دیتا۔ میں نے ایک دن اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ سمجھا کہ مجھے کوئی کام کروانا ہے۔ وہ میرے پاس آ کر نہایت ادب سے بولا:

''جی فرمایئے۔''

''آپ کا نام کیا ہے؟'' میرے سوال پر اُس نے جواب دیا:

''میرا نام ناصر ہے، یعنی مدد کرنے والا۔''

''آپ گھر نہیں جاتے، میں صبح سے شام تک آپ کو یہیں دیکھتا ہوں۔''

''میری ملازمت کا وقت دو بجے ختم ہو جاتا ہے۔ میں تب تک گردہ وارڈ تک محدود رہتا ہوں، اس کے بعد دو سے چھے بجے تک مختلف وارڈوں میں جاتا ہوں، ایمرجنسی کا چکر لگاتا ہوں، شاید کوئی ایسا ہو جسے میری مدد کی ضرورت ہو، ایک ناصر نے دوسرے ناصر کو اِس کام پر لگایا ہے۔''

''ایک ناصر، دوسرا ناصر میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے ناصر کے معصوم چہرے کی طرف دیکھا۔ ناصر نے کچھ سوچ کر جواب دیا:

''پانچ سال پہلے میں اپنی والدہ صاحبہ کا علاج کروانے کے لیے یہاں آیا تھا۔ گاؤں سے آنے والا ایک واجبی سی تعلیم والا چودہ پندرہ سال کا لڑکا یہاں کی افراتفری دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ میری کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں جاؤں؟ کس سے مدد لوں؟ والد صاحب ایک کارخانے میں ملازم تھے۔ انھیں چھٹی نہیں ملی تھی، جس کے باعث میں اکیلا ہی اپنی والدہ کو شہر لایا تھا۔ یہاں مجھے قدم قدم

پر مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ ہسپتال پہنچا تو یہاں اتنے مریض تھے کہ میں انھیں دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ سب بے چینی اور پریشانی کے عالم میں اُدھر اِدھر پھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان پریشان حال لوگوں میں میری والدہ اور میں بھی شامل تھے۔ رات بھر کے سفر کے باعث تھکن سے میرا اور والدہ کا حال بُرا تھا۔ بیرونی حصے میں مریضوں کا ابتدائی معاینہ جاری تھا۔ میں نے ایک لمبی قطار میں کھڑے ہو کر پرچی بنوائی۔ پرچی بنانے والا نوجوان سب سے بدتمیزی کر رہا تھا۔ میں نے پرچی لے کر اُس سے پوچھا کہ میری باری کب آئے گی تو اُس نے غصیلے انداز میں مجھے گھورتے ہوئے کہا:

''مجھے کیا معلوم کہ تمھاری باری کب آئے گی، بیٹھ جاؤ، جب باری آئے گی، کمرہ نمبر 3 میں چلے جانا۔''

''کیسا کڑا وقت تھا۔'' یہ کہتے ہوئے ابو جان کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئے تو شہزاد بھیا بولے:

''پھر کیا ہوا ابو جان!؟''

''ناصر نے مجھے اپنی کہانی سناتے ہوئے بتایا کہ وہ اپنی امی جان کے ساتھ برآمدے میں بیٹھ گیا۔ تین گھنٹے بعد باری آئی۔ ڈاکٹر نے پہلی والی رپورٹ دیکھ کر بتایا کہ گردوں کی حالت خاصی خراب ہے، آپ فوری نگہداشت کے کمرے میں جایئے، وہاں ان کے دوبارہ ٹیسٹ ہوں گے، وہی فیصلہ کریں گے کہ انھیں ہسپتال میں داخل کرنا ہے یا نہیں۔ فوری نگہداشت کے کمرے میں بھی بہت بھیڑ تھی۔ اس وقت وہ کمرا چیخوں سے گونج اٹھا جب ایک زخمی زخموں کی تاب نہ لا کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔'' ناصر نے بتایا:

''میں وہاں پریشانی کے عالم میں بیٹھا تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو بیس، بائیس سال کا ایک نوجوان مجھے دکھائی دیا۔

''مجھے ناصر کہتے ہیں۔''

''ناصر۔'' میں نے دہرایا۔

''جی، میں ناصر ہوں، میرے نام کا مطلب ہے مددگار، مدد کرنے والا۔ میں اسی ہسپتال میں ملازم ہوں، جب میری ملازمت کا وقت ختم ہو جاتا ہے تو میں اگلے چار گھنٹے صرف اور صرف ناصر ہوتا ہوں، یعنی یہاں آنے والا لوگوں کی مدد کرتا ہوں۔ بتاؤ، میں تمھاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' ناصر کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

میں نے ساری بات اسے بتا دی۔ اگلے دو گھنٹے میں والدہ صاحبہ کے ٹیسٹ ہو گئے اور اُنھیں زنانہ گردہ وارڈ میں داخل کر لیا گیا۔

''میں اب چلتا ہوں، میرا نمبر لے لو، جب ضرورت ہو، مجھے فون کر دینا، میں فوراً آ جاؤں گا۔ ارے، میں نے تمھارا نام تو پوچھا ہی نہیں!''

''میرا نام بھی ناصر ہے۔''

''بہت خوب! تم میرے ہم نام ہو۔''

ہم ہسپتال میں پندرہ دن رہے۔ ہمیں ناصر کے ہوتے ہوئے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ ہر کام آسانی سے ہوتا رہا۔ ہسپتال سے رخصت ہوتے وقت میں نے ناصر کا شکریہ ادا کیا تو اُس نے کہا:

''میری خواہش ہے کہ تم بھی میری طرح لوگوں کے مددگار بنو۔ زندگی میں جب بھی موقع ملے لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنا، ان کی مدد کرنا۔''

''میں ایسا ہی کروں گا۔'' پھر میں نے اپنے ہم نام سے ہاتھ ملایا اور گلے مل کر وہاں سے اپنی والدہ کے ساتھ اپنے شہر آ گیا۔'' ناصر یہ کہتے ہوئے دور، بہت دور کہیں کھو گیا۔

''پھر کیا ہوا ابو جان!؟'' بڑے بھائی ظہیر بولے۔

ابو جان نے ناصر کی کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے بتایا کہ اس کے بعد ناصر کئی مرتبہ اپنی والدہ کو لے کر شہر آیا۔ ہر بار وہاں موجود ناصر نے اس کی مدد کی۔ تین سال علاج جاری رہا۔ علاج کے باوجود وہ صحت یاب نہ ہوئیں، بیماری کے باعث اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ وقت نے یہ زخم بھر دیا۔

صفحہ نمبر 46 پر

پھول کہانی 2

گھر کا کام

ابن الاسلام خاکی۔ کراچی

پیر کا دِن تھا، پھول اسکول کا وقت ہو چکا تھا۔ سر سورج مکھی صاحب حاضری لے رہے تھے۔

"دن کا راجا؟"

"حاضر جناب!"

"موتیا؟"

"حاضر جناب!"

"سدا بہار؟"

......خاموشی۔

اتنے میں سدا بہار ہانپتا ہوا دروازے سے داخل ہوا۔

"تاخیر کیوں ہوئی؟" سر سورج مکھی نے پوچھا۔

"تاخیر اِس لیے ہوئی کہ راستے میں خالہ یاسمین نے روک لیا تھا، کہنے لگیں:

"بیٹا! تم تو ہر موسم میں کھلے رہتے ہو، مجھے بھی نسخہ بتاؤ۔"

"اچھا، گھر کا کام (ہوم ورک) کرلیا؟" سر سورج مکھی نے اگلا سوال کیا۔

"جی سر! گھر کا کام تھا: روز کھلنے کے پانچ فائدے۔ میں نے کرلیا۔"

"اچھا، چلو ذرا اپنا کام سناؤ۔"

سدا بہار نے گلا کھنکار کر اپنا کام سنانا شروع کیا:

"نمبر 1: ہم ہر دِن کھلتے ہیں، اس لیے بچے ہمیں دیکھ کر اِسکول دیر سے نہیں پہنچتے۔"

"وہ کیسے؟" موتیا نے دھڑ سے سوال کیا۔

"امی کہتی ہیں: بیٹا! سدا بہار کھل گیا، مطلب صبح ہوگئی۔ اٹھ جاؤ!" سدا بہار نے بتایا۔

سب نے سبحان اللہ کہا۔

"نمبر 2: ہم غریب مالی کا ساتھ دیتے ہیں۔ مہنگی کھاد نہیں مانگتے، ہر مٹی میں اُگ جاتے ہیں۔" سدا بہار نے دوسرا فائدہ بیان کیا۔

بقیہ صفحہ نمبر: 50

☆ دو طالب علم باتیں کر رہے تھے۔

ایک بولا: ”کل میں نے اتنا پڑھا کہ کتاب خود بولنے لگی!“

دوسرا ہنسا: ”پھر کیا کہا اس نے؟“

پہلا بولا: ”کہ بس کرو بھائی! اب مجھے بھی آرام چاہیے!“

☆ امی نے بیٹے سے کہا:

”بیٹا! باہر جا کر دیکھو، بارش ہو رہی ہے یا نہیں؟“

بیٹا دروازے تک گیا، واپس آکر بولا:

”نہیں امی! بارش نہیں ہو رہی، بس آسمان سے پانی گر رہا ہے!“

☆ دو بہن بھائی کھیل رہے تھے۔

بہن بولی: ”میں ڈاکٹر بنوں گی۔“

بھائی بولا: ”اور میں مریض۔“

بہن نے فوراً کہا: ”ٹھیک ہے، پہلے فیس دو۔“

(لبیبہ سنایہ۔ کراچی)

☆ ایک بچے نے ابو سے پوچھا:

”ابو! کیا میں بڑا ہو کر کچھ بھی بن سکتا ہوں؟“

ابو بولے: ”ہاں بیٹا!“

بچہ خوش ہو کر بولا: ”پھر میں چھٹی کا دِن بنوں گا، کیوں کہ اسے سب بچے پسند کرتے ہیں۔“

☆ ایک دوست: ”بارش کی ہر بوند میں تمھاری یاد آتی ہے۔“

دوسرا دوست: ”طعنے مت دو، مجھے یاد ہے کہ تمھاری چھتری واپس کرنی ہے۔“

(معاویہ مدثر۔ حیدر آباد)

☆ ایک پاگل (دوسرے پاگل سے):

”میں چھوٹا سا تھا تو مینارِ پاکستان سے گر گیا تھا۔“

دوسرا پاگل: ”تو پھر بچ گئے تھے یا مر گئے تھے؟“

پہلا: ”مجھے کیا پتا! میں تو بہت چھوٹا سا تھا۔“

☆ ایک بے وقوف (دوسرے سے):

”بتاؤ، سمندر میں روشنی کے مینار کیوں بنائے جاتے ہیں؟“

دوسرا بے وقوف: ”تاکہ مچھلیاں راستہ بھول کر خشکی میں نہ آجائیں۔“

(فرزانہ عدنان۔ لاہور)

☆ بچہ فون پر (ڈاکٹر سے):

”کیا آپ کے پاس درد کی دوا ہے؟“

ڈاکٹر: ”درد کہاں ہے؟“

بچہ: ”ابھی تو نہیں ہے، آدھے گھنٹے بعد ہوگا، جب ابو میرا نتیجہ دیکھیں گے۔“

☆ ایک دوست (دوسرے سے):

”کوئی ایسا طریقہ بتاؤ جس سے میرا بجلی کا بل کم آیا کرے۔“

دوسرا دوست: ”جب بجلی نہ ہو تو تمام بتیوں کے بٹن کھول دیا کرو اور جب بجلی آجائے تو تمام بٹن بند کر دیا کرو۔

☆ بہن (چھوٹے بھائی سے): ”کتاب کیوں ضروری ہے؟“

چھوٹا بھائی: ”کیوں کہ اس کے بغیر بستہ خالی لگتا ہے!“

(عامر اعجاز۔ کوہاٹ)

میں تو اُمتی ہوں

سیدہ ناجیہ شعیب احمد۔ کراچی

عمیر اَحمد صاحب، جنید جمشید مرحوم کی زندگی سے بہت متاثر تھے، اسی لیے جب ان کے اکلوتے بیٹے بہو کے آنگن میں پہلا پھول کھلا تو اُنھوں نے اس کا نام ''جنید'' رکھا۔

جنید نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ خالص دنیاوی تھا، وہ سب بس نام کے مسلمان تھے۔ ایسا خاندان جہاں موسیقی کو رُوح کی غذا سمجھا جاتا تھا۔ جنید کے چاچو اور اُن کے بچے بھی گلوکاری میں خاصی دل چسپی رکھتے تھے۔

☆

عمیر صاحب کے دادا عالم دین تھے اور دَادی نہایت نیک خاتون تھیں۔ دونوں نے اپنے بچوں کی اچھی پرورش کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ عمیر صاحب اپنے والدین کے بڑے بیٹے تھے۔ اماں کی خواہش پر اُنھوں نے قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد

درسِ نظامی کا نصاب مکمل کیا، جب کہ ان کے باقی تین بھائیوں نے دنیاوی تعلیم حاصل کی۔ اماں ابا کے جیتے جی وہ مارے باندھے نماز پڑھ لیتے، مگر اُن کے دنیا سے گزرنے کے بعد گھر کا ماحول ایک دم تبدیل ہوگیا۔ عمیر احمد چھوٹے بھائیوں کو گانے بجانے سے روکنے ٹوکنے لگے تو سبھی ایک ایک کر کے انھیں چھوڑ کر چلے گئے۔

......☆......

عمیر احمد ایک باعمل مسلمان تھے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے نیک اور صالح اولاد کی دعائیں مانگیں، لیکن شاید اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

عبید احمد ایک جدت پسند اِنسان تھے، انھیں اپنے ابا جی کی اسلامی تعلیمات، پند و نصائح اور پرانی سوچ سے چڑ ہوتی تھی۔ وہ ان کی باتیں سننا ہی نہیں چاہتے تھے۔ عمیر احمد دوبارہ اکیلے نہیں ہونا چاہتے تھے، اسی لیے انھوں اپنے ہونٹ سی لیے، مگر دُعا کرنا نہیں چھوڑا۔ ان کی دعاؤں میں دن بدن شدت آتی جا رہی تھی۔

......☆......

پھر جنید پیدا ہوا۔ عمیر احمد کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ دادا کی جان جنید میں بستی تھی۔ بوڑھے دادا کی آنکھوں کا تارا تھا وہ۔

جنید کو جب بھی ان کی صحبت ملتی وہ ان کی آغوشِ محبت میں بہت سکون اور اِطمینان محسوس کرتا۔ خوشی سے قلقاریاں مارتا۔

وہ اسے تلاوتِ قرآن سناتے، جھوم جھوم کر نعتیں پڑھتے۔ ننھا جنید توجہ سے سنتے سنتے مزے سے سو جاتا اور دادا، پوتے کو گھنٹوں گود میں لیے بیٹھے رہتے۔ ان کے دن کا بیش تر حصہ جنید کے ساتھ گزرتا۔

......☆......

جنید بہت پیارا بچہ تھا۔ اس کی من موہنی صورت دیکھ کر ہر کسی کو اُس پر پیار آتا تھا۔ جب اس نے پہلی بار اپنی زبان سے ''اللہ'' کہا تو عمیر احمد فرطِ جذبات سے رو دیے۔ اور جب انھیں جنید نے ''دادو'' کہہ کر پکارا تو وہ جی جان سے نہال ہوگئے۔

جنید بہت جلدی بولنا سیکھ رہا تھا۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جنید کو بہت ہی خوب صورت آواز سے نوازا تھا۔ بس یہیں سے گڑبڑ شروع ہوئی۔

جنید کے امی بابا نے دادا کے لاکھ سمجھانے اور روکنے کے باوجود اِنتہائی قدم اٹھالیا۔

جس دن تین سالہ جنید کو موسیقی سکھانے کے لیے استاد نے گھر میں پہلا قدم رکھا، اُسی دن دادا کو دِل کا پہلا دورہ پڑا۔

وہ بستر سے جا لگے۔ کمزوری اور نقاہت کے باوجود وہ جنید کو دیکھ کر اُٹھنے کی کوشش کرتے۔

جنید نے اللہ جی سے اپنے دادو کی صحت اور تن درستی کے لیے دعائیں مانگیں اور وہ قبول ہوئیں۔ اس کے دادا جلد صحت یاب ہوگئے تھے۔

......☆......

ایک دن جب گھر میں بے ہنگم موسیقی بج رہی تھی، دادو نے جنید کو اپنے قریب بلایا اور سمجھاتے ہوئے کہا: ''بیٹا! یہ آوازیں دل کو تو بہلا سکتی ہیں، مگر رُوح کو سکون نہیں دے سکتیں۔''

پھر وہ شفقت اور نرمی سے اس کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے بولے:

''بیٹا! اپنے دل کو قرآن کی تلاوت سے آباد رکھنا، یہی حقیقی چیز ہے جو ایمان جگاتی ہے۔''

جنید، دادو کے پاس بیٹھا سنتا رہتا اور اُن کی باتیں جیسے دل میں اترتی جاتیں۔

وہ اکثر کہتے:

''بیٹا! زندگی میں اگرچہ سب کچھ کھو دو، مگر اِیمان نہ کھونا۔''

جنید اَب سات سال کا ہوگیا تھا۔ دادو نے اسے نماز سکھائی، مسنون دعاؤں کے ساتھ قرآنی سورتیں بھی حفظ کروائیں۔

ان کی دلی تمنا تھی کہ جنید قرآن کا حافظ بنے۔ جنید کی آواز کا لحن تلاوتِ قرآن پاک کے لیے مختص ہو، نہ کہ لہو ولعب کے لیے۔

اس کے برعکس عبید اَحمد اور اُن کی بیگم کی سر توڑ کوشش تھی کہ جنید

بین الاقوامی گلوکار بنے۔ جھوٹی شہرت اور مقبولیت حاصل کر کے دولت کے انبار لگا دے۔

......☆......

وقت تیزی سے گزرتا گیا۔ جنید بڑا ہوتا گیا۔ اس کا رجحان موسیقی کی طرف ہونے لگا، کیوں کہ اسکول میں بچوں کو باقاعدہ موسیقی کی تعلیم دی جاتی تھی، لیکن کچھ ہی عرصے میں جنید بےزار ہونے لگا۔

جس دن جنید کے اسکول میں سالانہ تقریب تھی اسی دن دادو کو دِل کا جان لیوا دورہ پڑا اور چند گھنٹوں میں وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

......☆......

جنید کی امی فروا صاحبہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ملازمت پیشہ خاتون تھیں اور بابا عبید صاحب مشہور و معروف کاروباری شخصیت، جو کاروبار کی وجہ سے اکثر اندرون اور بیرونِ ملک سفر میں رہتے۔ دادو کی وفات کے بعد جنید ملازموں کے رحم و کرم پر رہنے لگا۔ وہ اکثر اِسکول سے واپس آ کر دادو کے کمرے میں وقت گزارتا۔ دادا کی خوش بو، تلاوتِ قرآن کی آواز اور اُن کے نرم ہاتھوں کی گرمی اب یاد بن چکی تھی۔

......☆......

ایک روز گھر کے سب سے بزرگ ملازم نور الدین نے جنید کو دادو کے کمرے میں اکیلا اور اُداس بیٹھا دیکھا تو عبید صاحب سے درخواست کی کہ وہ جنید کو وقت دیا کریں۔ عبید صاحب نے ''ہوں'' کر کے ٹال دیا۔

تاہم نور الدین کے بار بار توجہ دلانے پر ایک دن عبید صاحب نے جنید کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھ ہی لیا:

''کیا ہوا جنید! اسکول میں دل نہیں لگتا؟''

جنید نے ہچکچاتے ہوئے کہا:

''نہیں بابا! دادو کہا کرتے تھے کہ ہر آواز اچھی نہیں ہوتی، کچھ آوازیں شیطان کو خوش کرتی ہیں۔''

جنید نے حدیث پاک بھی سنائی۔

''الجرس مزامیر الشیطان''

(گھنٹی یا ساز شیطان کی بانسری ہے۔)

(الصحیح لمسلم: 2114)

عبید صاحب کے دل پر یہ الفاظ جیسے تیر کی طرح جا لگے، مگر پتا نہیں کیوں وہ خاموش رہے۔

زندگی اپنی چمک دمک کے ساتھ رواں دواں رہی۔ جنید کے کمرے میں گٹار، پیانو اور مختلف آلاتِ موسیقی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ عبید صاحب کو یہ سب بُرا نہ لگتا تھا، کیوں کہ وہ نادانی میں یہ سمجھتے تھے کہ موسیقی بھی ایک فن ہے اور فن کی قدر کرنی چاہیے۔

جنید عجیب کیفیت کا شکار ہو کر سوچتا:

''امی بابا چاہتے ہیں کہ میں جدید زمانے کے مطابق چلوں، دنیا دیکھوں، موسیقی میں دل چسپی لوں، مگر میرا دِل خالی ہے، نہ گانوں میں لذت محسوس ہوتی ہے نہ محفلوں میں سکون، کیا کروں؟''

پھر ایک دن اچانک سب کچھ بدل گیا۔

عبید احمد صاحب پر فالج کا شدید حملہ ہوا۔ یہ خبر بجلی بن کر گری۔ امی حواس باختہ تھیں اور جنید کے قدم لرز رہے تھے۔

رات کے سناٹے میں باپ کے بستر کے پاس بیٹھے بیٹھے جنید کو اپنے دادو شدت سے یاد آئے۔

وہی الفاظ گونجے:

''بیٹا! زندگی میں اگرچہ سب کچھ کھو دو، مگر اِیمان نہ کھونا۔''

جنید نے پہلی بار دِل سے دعا مانگی۔

قرآن کھولا، مگر پڑھنا بھول چکا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی تلاوت شروع کی۔ وہ پڑھتا جاتا اور روتا جاتا۔

......☆......

جنید صاحب نلکیوں میں جکڑے بے سدھ پڑے تھے۔ ابا کی آواز اُن کے شعور میں گونجی:

''سانسوں کی ڈوری ٹوٹی نہیں، الجھی ہوئی ہے۔ عبید! اب بھی وقت ہے، روٹھے رب کو منا لے۔''

سورۂ رحمٰن کی پُرسوز تلاوت کی صدا نے انھیں آنکھیں کھولنے

پر مجبور کر دیا۔

سرہانے جنید کو پایا تو بے ساختہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''بیٹا! تمھاری آواز سُن کر یوں لگا جیسے ابا میرے آس پاس ہیں۔''

......☆......

بابا کی بیماری، آزمائش اور بے چین طبیعت نے جنید کو بے سکون کر دیا تھا۔

اس نے اس سلسلے میں دادو کے جگری دوست مفتی محمد حاطب سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔

مفتی حاطب صاحب سر جھکائے تسلی سے اس کی دلی کیفیت سنتے رہے۔ اس دوران میں اسے خوب ڈھارس بندھائی اور شفقت سے پیش آئے۔ انھوں نے مختصر بات کرتے ہوئے کہا: پیارے نبی ﷺ کے ارشاد کا مفہوم ہے:

اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں بانسریوں، گانے بجانے کے آلات اور جاہلیت کے کاموں کو مٹا دوں۔''

پھر انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے دعا دی:

''اللہ تعالیٰ تمھیں ہدایت پر قائم رکھے۔ بیٹا! تمھارا دِل ہی اصل ساز ہے، جو صرف اللہ تعالیٰ کے نام پر دھڑکنا جانتا ہے۔''

یہ الفاظ جنید کے دل پر نقش ہو گئے۔

وہ رات اس نے آنسوؤں میں گزاری۔

......☆......

اگلی صبح روشن آغاز تھی۔ وہ اٹھا، الماری کھولی، ایک ایک ساز اٹھایا، دیر تک اسے دیکھتا رہا، پھر آہستہ سے گنگنایا:

''میں تو اُمتی ہوں......''

گٹار دو ٹکڑے کر کے اس روز جنید نے موسیقی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔

......☆......

آج جنید حافظِ قرآن ہے۔ اس کا شمار ملک کے بہترین قرا حضرات میں ہوتا ہے۔ وہ نعتیں پڑھتا ہے اور اپنے والدین کی خدمت عبادت سمجھ کر کرتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں: ''جنید احمد بدل گیا ہے۔''

وہ مسکرا کر بس اتنا کہتا ہے:

''میں تو اُن ﷺ کا امتی ہوں، اور سچا امتی وہی ہے جو لوٹ آئے اپنے نبی ﷺ کی طرف۔''

بقیہ: پھر کیا ہوا 31

میٹرک کرنے کے بعد ناصر کو اُسی ہسپتال میں ملازمت مل گئی، جس میں پہلے ہی ایک ناصر موجود تھا۔ اب وہاں ایک نہیں دو ناصر تھے۔ اس کی کبھی رات اور کبھی دن کی ذمے داری ہوتی۔ وہ اپنی ملازمت کے اوقات کے بعد بھائی ناصر کی طرح مزید چار گھنٹے ہسپتال میں گزارتا۔ وہاں پریشان حال لوگوں کی مدد کرتا۔ جب وہ دعائیں دیتے تو دِلی سکون ملتا۔ ہسپتال کے ملازمین ناصر بھائی کو بڑا ناصر اور اُسے چھوٹا ناصر کہتے تھے۔ جب تک دم میں دم رہا لوگوں کی خدمت کا سلسلہ جاری رہا۔''

''یہ تھی دو ناصروں کی کہانی، جو میرے ابو جان نے ہمیں سنائی اور وہی کہانی آج میں نے اپنے بچوں کو سنائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دوسروں کے لیے ناصر بننے کی توفیق عطا فرمائے۔'' دادی جان کے منہ سے دعائیہ کلمات سن کر سب نے بآواز بلند کہا:

''آمین! ثم آمین!''

(پھر کیا ہوا؟ یہ جاننے کے لیے اگلے شمارے میں پڑھیے، ایک نئی کہانی، دادی جان کی زبانی)

نئے لکھاری

زنجیروں کے سائے 2

محمد حمزہ اویس۔ کراچی

’’ہمیں ان دونوں کو لے جانا ہوگا، یہ خطرناک لگ رہے ہیں۔‘‘ ایک دوسرے فوجی نے کہا۔

اور پھر، لوہے کی زنجیریں ان کے کمزور، مگر بہادر ہاتھوں میں ڈال دی گئیں۔ حمزہ اور عمر کو اِسرائیلی فوجی گاڑی میں ڈال کر ایک نامعلوم مقام کی طرف لے جانے لگے۔

اندھیری رات کے سائے اور گہرے ہوگئے تھے اور اِن معصوم بچوں کے مستقبل پر مزید ظلم کی سیاہ چادر تان دی گئی تھی۔

رات کی تاریکی میں ایک بکتر بند گاڑی تیزی سے صحرائی راستوں پر دَوڑ رہی تھی۔ اندر لوہے کی زنجیروں میں جکڑے دو کم عمر لڑکے، حمزہ اور عمر، اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے چہروں پر زخموں کے نشان تھے، ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور جسم زخموں سے چور تھا، مگر اُن کی آنکھوں میں خوف کے بجائے عزم کی چمک تھی۔

گاڑی کے اندھیرے میں عمر نے آہستہ سے سرگوشی کی: ’’حمزہ! یہ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟‘‘

حمزہ نے زخمی ہونٹوں کو سختی سے بھینچا: ’’جہاں بھی لے جائیں، ہمیں ڈرنا نہیں ہے۔ ہم فلسطینی ہیں، ہم کمزور نہیں ہیں۔‘‘

اچانک گاڑی میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور ایک اسرائیلی فوجی اندر جھانکا۔ وہ مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا: ’’تمھیں ایسی جگہ لے جا رہے ہیں جہاں تمھاری چیخیں بھی باہر نہیں نکل سکیں گی۔‘‘

پھر ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ کچھ دیر بعد گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ دروازہ کھلا اور تیز روشنی نے ان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ باہر مسلح فوجی کھڑے تھے، بندوقیں تانے، جیسے کسی خطرناک دہشت گرد کو قید خانے لایا جا رہا ہو۔

’’اتارو اِنھیں!‘‘ ایک فوجی نے سخت لہجے میں حکم دیا۔

دونوں لڑکوں کو کھینچ کر باہر نکالا گیا۔ سامنے اسرائیلی جیل کی بلند و بالا دِیواریں کھڑی تھیں۔ دیواروں پر خاردار تاریں تھیں اور ہر طرف بندوق بردار سپاہی چوکنے کھڑے تھے۔ اندر سے قیدیوں کی سسکیاں اور دَردناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

عمر کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا۔ وہ بمشکل چل پا رہا تھا۔ حمزہ نے اپنے دوست کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور آہستہ سے کہا: ’’ہمت رکھو، ہم ٹوٹیں گے نہیں!‘‘

فوجیوں نے انھیں زبردستی گھسیٹتے ہوئے اندر لے جانا شروع کیا۔ راستے میں انھوں نے کئی فلسطینی قیدی دیکھے، جو بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو چکے تھے۔ کچھ کی آنکھوں پر پٹیاں تھیں، کچھ کے جسم

زخموں سے بھرے ہوئے تھے، اور کچھ کو اُلٹا لٹکا کر بجلی کے جھٹکے دیے جا رہے تھے۔

”یہی انجام ہوتا ہے بغاوت کرنے کا!“ ایک فوجی نے چیخ کر کہا اور ایک قیدی کو ٹھوکر مار کر نیچے گرا دیا۔

حمزہ کا دِل خون کے آنسو رو رہا تھا، مگر اُس نے خود کو مضبوط رکھا۔

انھیں ایک اندھیری، بدبودار کوٹھری میں دھکیل دیا گیا۔ اندر سڑے ہوئے کھانے کی بُو تھی، دیواروں پر پُرانے خون کے دھبے تھے اور فرش پر چوہے بھاگ رہے تھے۔

”یہ ہے تمھارا نیا گھر!“ ایک فوجی ہنسا۔ ”یہاں سے زندہ نکلنے کی امید مت رکھنا!“

دروازہ دھڑام سے بند ہوا اور باہر تالا لگا دیا گیا۔

حمزہ نے عمر کو دیکھا، جو دِیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کانپ رہا تھا۔

”حمزہ، ہمیں یہاں سے کون بچائے گا؟“ عمر نے روتے ہوئے کہا۔

حمزہ نے آسمان کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا: ”اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ عمر! بس ہمیں ہمت نہیں ہارنی۔“

مگر یہ صرف ایک آغاز تھا، اذیتوں کی رات ابھی لمبی تھی۔

......(جاری ہے)......

السلام علیکم

ثناء عثمان۔ کراچی

پیارے بچو! آج کل اس دورِ جدید میں ہم اپنے ریت اور رِواج کو بھولے چلے جا رہے ہیں۔ ہم لوگوں نے غیر مسلموں کے طرزِ عمل کو اپنا لیا ہے اور اِس پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ آج کل جب لوگ آپس میں ملتے ہیں تو اُن کے الفاظ ”ہائے“، ”ہیلو“ اور ”اور کیا حال ہیں“ کی طرح کے ہوتے ہیں، جب کہ ہمارا مذہب ہمیں اتنا خوب صورت کلمہ سکھاتا ہے، جو نہ کہ صرف ملتے وقت بولنے کی رسم ہے، بل کہ ایک قسم کی عبادت اور دُعا بھی ہے۔ شریعت اسلام نے ہمیں سلام کی ترغیب دی ہے۔

السلام علیکم کا مطلب ہی اتنا خوب صورت ہے: ”تم ہر تکلیف، رنج اور مصیبت سے سلامت رہو۔“ یہ صرف ایک کلمہ ہی نہیں، دعا بھی ہے، اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا ذریعہ ہے اور اِس سے سامنے والے کے لیے محبت کا اظہار بھی ہے۔

ہمارے پیارے نبی ﷺ نے سلام کی تاکید فرمائی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا:

”تم جنت میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے جب تک مومن نہ ہو اور تمھارا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو۔ میں تمھیں ایسی چیز بتاتا ہوں کہ اگر تم اس پر عمل کرلو تو تمھاری آپس میں محبت قائم ہو جائے گی۔ وہ یہ کہ آپس میں سلام کو عام کرو، خواہ تم پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو۔“

تو پیارے بچو! آج سے ہم یہ عہد کرلیں کہ جب بھی ہم کہیں جائیں گے یا کہیں سے آئیں گے سب کو سلام کریں گے یا ٹیلی فون پر کسی سے بات ہو یا کوئی بھی شخص راستے میں ملے، سب کو سلام کریں گے اور جب کوئی ہمیں سلام کرے گا اس کا جواب ضرور دیں گے۔

آپ دیکھیے گا، ہمارے اس عمل سے کتنی برکات ہوں گی اور اللہ تعالیٰ ہم سے خوش ہوں گے۔

بیس روپے

حبیبہ محمد اسامہ سرسری۔ کراچی

ایک دفعہ کا ذِکر ہے کہ ایک گھر میں دو بھائی اپنے والدین کے ساتھ رہتے تھے، ایک کا نام علی اور دُوسرے کا نام عمران تھا۔ اس گھر کے افراد بہت نیک تھے، لیکن ان کے پاس پیسوں کی کمی تھی، کیوں کہ ان کے ابو مزدوری کرتے تھے۔ ان کی امی انھیں سمجھایا کرتی تھیں کہ ہمیں کوئی چیز لینے کی خواہش ہو تو ہمیں اللہ

تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ ہمیں وہ چیز ضرور دیں گے یا اس کے بدلے کچھ اور عطا کردیں گے۔ کہیں آتے جاتے کوئی بزرگ مل جائیں تو ہمیں انھیں سلام کرنا چاہیے اور اُن کی مدد کرنی چاہیے۔ یہ دونوں اپنی امی کی بات کو غور سے سنتے اور اُن پر عمل کرنے کی پوری کوشش کرتے۔

ایک دن وہ جا رہے تھے، انھیں چیز کھانی تھی۔ ان دونوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی: ''اے اللہ! ہمیں چیز کھانی ہے، آپ ہمیں چیز دے دیں یا چیز کے لیے تھوڑے پیسے دے دیں۔'' وہ یہ دعا مانگتے ہوئے جا رہے تھے کہ ان کی نظر ایک بزرگ پر پڑی، جو بہت سا سامان اٹھائے جا رہے تھے۔ یہ دونوں بزرگ کے پاس گئے اور اُنھیں سلام کیا۔

ان بزرگ نے سلام کا جواب دیا۔ عمران نے کہا: ''بابا جی! آپ اتنے بوڑھے ہوگئے ہیں، یہ سامان آپ کیوں اٹھاتے ہیں؟''

بابا جی نے کہا:

''بیٹا! کیا کریں، میری کوئی اولاد نہیں، لہٰذا یہ سامان مجھے ہی اٹھانا پڑتا ہے۔''

علی نے کہا:

''بابا جی! ہم آپ کے بیٹوں کی طرح ہیں، یہ سامان ہم اٹھا کر آپ کے گھر تک پہنچا دیتے ہیں۔''

بابا جی نے ان کا بہت شکریہ ادا کیا اور دُعائیں دیں۔ ان دونوں بچوں نے مل کر بابا جی کا سامان ان کے گھر تک پہنچایا۔ بابا جی نے خوش ہو کر اُن بچوں کو بیس، بیس روپے دیے۔ ان دونوں نے لینے سے منع کیا اور کہا کہ بابا جی! اس کا بدلہ تو ہمیں اللہ تعالیٰ ہی دیں گے۔ بابا جی نے کہا کہ میری طرف سے تم دونوں چیز کھا لینا۔ ان دونوں نے بابا جی کا شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے سیدھا چیز کی دکان پر آئے۔ انھوں نے چیز خریدی اور گھر جا کر اپنی امی کو ساری بات بتائی۔ ان کی امی نے بھی انھیں شاباش دی۔

باہمت چیونٹی

سجاد علی۔ فاضل پور

''لگتا ہے آج موسم کے تیور کچھ ٹھیک نہیں ہیں، مجھے جلد اَز جلد یہاں سے کھانا لے کر گھر پہنچنا ہوگا، اس سے پہلے کہ موسم بگڑ جائے اور میں کسی مصیبت میں پھنس جاؤں۔ بڑی مشکل سے تو آج اتنا اچھا کھانا ہاتھ لگا ہے۔''

چیونٹی نے اپنے سے تین گنا وزنی کھانا اپنی پیٹھ پر رکھتے ہوئے کہا اور پھر اپنی منزل کی طرف چل پڑی۔ کافی تلاش کے بعد اُسے یہ کھانا ملا تھا، جسے پا کر وہ بہت مسرور تھی، کیوں کہ اس کھانے سے اس کا اور اُس کے بچوں کا مہینے بھر کا گزارا ہو جائے گا۔ وہ پہاڑی کی دراڑ میں رہتی تھی اور یہاں سے اس دراڑ کا فاصلہ کافی زیادہ تھا، جس بنا پر اُسے اب یہ پریشانی لاحق ہوگئی تھی کہ وہ صحیح سلامت گھر پہنچ جائے، کیوں کہ موسم خراب ہو رہا تھا۔ ہوا جو اُس کے بالکل مخالف چل رہی تھی اُس میں تیزی آتی جا رہی تھی، جس کی وجہ اسے پہاڑی پر چڑھنے میں دِقت ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو اور کھانے کو بڑی مشکل سے سنبھالا ہوا تھا۔ ادھر آسمان پر گھٹاؤں نے بھی ڈیرے ڈالنے شروع کر دیے تھے۔

بارش کے خطرے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے چیونٹی نے تیزی سے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا، کیوں کہ اسے لمبی مسافت طے کرنا تھی، لیکن تیز ہوتی ہوئی ہوا کے باعث اس کے لیے آگے بڑھنا دشوار ہو رہا تھا، اس کے پاؤں مضبوطی سے نہیں جم پا رہے تھے۔ کبھی وہ جھٹکا کھاتے ہوئے اپنے بائیں طرف چلی جاتی اور کبھی ہوا کے زور سے دو تین قدم پیچھے کی طرف پھسل جاتی۔ ایسی صورت میں توازن برقرار رکھنا بہت مشکل تھا، لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور گھبرائے بغیر آہستہ آہستہ رک رک کر تیز ہوا کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتی رہی۔

جب چیونٹی کی نظر کچھ دوری پر موجود اپنے گھر پر پڑی تو اُس کی ہمت مزید بڑھ گئی اور وہ پوری طاقت اور حوصلے کے ساتھ آگے بڑھنے لگی، لیکن اچانک ایک تیز ہوا کے جھونکے نے اسے ایسی پٹخنی دی کہ وہ نیچے کی طرف لڑھکتی ہوئی ایک خشک جھاڑی میں جا گری، خوش قسمتی سے اس کا کھانا بھی اسی جھاڑی میں پھنس گیا۔ چیونٹی زخمی ہو چکی تھی اور دَرد سے کراہ رہی تھی، لیکن اسے اپنے زخمی ہونے کا اتنا دکھ نہیں تھا جتنا اسے محنت سے تلاش کیے ہوئے کھانے کے کھو جانے کا غم تھا۔ اس نے مایوسی سے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی تو اُس کی نظر ساتھ ہی جھاڑی میں اٹکے اپنے کھانے پر پڑی، جسے دیکھتے ہی وہ اپنی ساری تکلیف بھول گئی اور اپنی قسمت پر رشک کرتے ہوئے بولی:

”لگتا ہے یہ کھانا میرے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ بس مجھے ہمت سے کام لینا ہے اور رَاستے کی مشکلات سے گھبرائے بغیر آگے بڑھنا ہے۔“

اس سے پہلے کہ ہوا کے جھونکے کھانا جھاڑی سے نکال کر کہیں دور لے جاتے اس نے ایک بار پھر کھانے کو اپنی پیٹھ پر لاد لیا اور اِس خیال سے کچھ دیر وہیں رکنے کا ارادہ کیا کہ شاید ہوا کی رفتار کچھ کم ہو جائے، پھر وہ چل پڑے گی۔

اچانک بادل گرجے اور بجلی کڑکی تو وہ ایک دم سے ڈر کے مارے ساکت ہو گئی۔ اس کا دِل زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ ”آج بچنا مشکل ہے۔“ وہ بڑبڑائی اور آسمان کی جانب دیکھا، گھنگھور گھٹا برسنے والی تھی۔

”اس سے پہلے کہ بارش شروع ہو جائے مجھے جلد اَز جلد گھر پہنچنا ہو گا، ورنہ بارش کا پانی اپنے ساتھ بہا لے جائے گا اور جان بھی جا سکتی ہے۔ مجھے اب مزید نہیں رکنا چاہیے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ چل پڑی اور اپنی رفتار بھی بڑھا دی۔ کچھ دیر بعد سامنے اپنا گھر قریب آتے دیکھ کر اُس کی رفتار میں مزید تیزی آ گئی۔ ہوا پورا زور لگا رہی تھی چیونٹی کے پاؤں اکھاڑنے کے لیے، لیکن اس نے خود کو مضبوطی سے سنبھالا ہوا تھا۔ اتنے میں بادل دوبارہ زور سے گرجے، جس سے چیونٹی ڈگمگائی، لیکن پھر سنبھل گئی۔ بس اب صرف دو، چار قدموں کا فاصلہ رہ گیا تھا اور پھر جیسے ہی وہ دراڑ میں داخل ہوئی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

بقیہ: پھول کہانی (2)

”واہ! یہ تو سچی بات ہے، تم تو پیدل چلنے کی جگہ (فٹ پاتھ) پر بھی اگ آتے ہو۔“ گیندے نے تائید کی۔

”نمبر 3: ہمارے کئی رنگ ہوتے ہیں، گلابی، سفید، جامنی، ہم سے بچے رنگوں کے نام سیکھتے ہیں۔“

سدابہار نے تیسرا فائدہ بتایا تو سورج مکھی صاحب نے داد دِی:

”بہت خوب! آگے؟“

”نمبر 4: تتلی اور بھنورے ہمارے پاس روز آتے ہیں، کیوں کہ ہم روز نیا پھول دیتے ہیں۔ ہماری وجہ سے وہ بھوکے نہیں رہتے۔“ یہ چوتھا فائدہ تھا جو سدابہار نے بتایا۔

”ہائے، یہ تو سب سے بڑا فائدہ ہے!“ چنبیلی نے خوشی کا اظہار کیا۔

”نمبر 5: ہم بتاتے ہیں کہ ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ سردی ہو یا گرمی، سدابہار کھلا رہتا ہے۔“

پانچواں اور آخری فائدہ سن کر پوری جماعت نے بیک زبان سبحان اللہ کہا۔

”مان گئے بھئی، میں تو ایک دفعہ پھول دیتا ہوں اور تھک جاتا ہوں، تم تو مشین ہو مشین!“ کیکٹس پچھلی نشست سے بولا۔

سدابہار شرما کر بولا:

”نہیں دوست! بس امی کہتی ہیں: جو تھوڑا تھوڑا کام کرے، لیکن روزانہ کرے، وہ کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ میں روز ایک پھول دیتا ہوں اور سدابہار کہلاتا ہوں۔“

سورج مکھی صاحب نے ستارے والا اِسٹیکر اس کی پتی پر چپکا دیا اور کہا:

”بچو! یہ ہے مستقل کام کی طاقت، جو روز کا کام روز کرے، وہ ہمیشہ تازہ رہتا ہے، جیسے ہمارا سدابہار۔“

”میں بھی آج سے اپنا کام ضرور کروں گا۔“ موتیا نے جھٹ سے کہا۔

”اور میں چیک کروں گا، کانٹا چبھو دوں گا جو نہ کرے گا۔“

سر سپید گلاب نے یہ کہا تو سب بچے ہنس دیے۔

البدر البرکہ اسکول کے لکھاری

آن لائن پڑھائی

نام: علقمہ عمیر۔ جماعت: ہشتم۔ درجہ: ب
شاخ: نارتھ ناظم آباد بوائز

آج میں آپ کے سامنے (بذریعہ انٹرنیٹ پڑھائی (آن لائن کلاسز) کے فائدے اور نقصانات بیان کرنے جا رہا ہوں۔ جدید دور میں بذریعہ انٹرنیٹ پڑھائی ہماری زندگی کا اہم حصہ بن چکی ہے، اس لیے اس کے اچھے اور بُرے پہلو جاننا ضروری ہے۔

فائدے:

☆ بذریعہ انٹرنیٹ پڑھائی میں گھر بیٹھے آسانی سے پڑھائی ہو جاتی ہے۔
☆ وقت ضائع کیے بغیر اُستاد سے فوراً رابطہ ہو جاتا ہے۔
☆ ریکارڈ شدہ اسباق دوبارہ سننا ممکن ہوتا ہے اور سمجھنا آسان ہوتا ہے۔
☆ بچے اپنی رفتار کے مطابق پڑھ سکتے ہیں۔
☆ آن لائن ٹولز اور وِیڈیوز سے پڑھائی مزید دِل چسپ ہو جاتی ہے۔
☆ سفر نہ ہونے سے وقت اور پیسے کی بچت ہوتی ہے۔

نقصانات:

☆ استاد ہر بچے پر برابر توجہ نہیں دے پاتے۔
☆ علمی سرگرمیاں اور کاموں کا مل جل کر کرنا کم ہو جاتا ہے۔
☆ گھر میں شور ہو تو توجہ مرکوز نہیں رہتی۔

آخر میں، میں یہی کہوں گا کہ بذریعہ انٹرنیٹ پڑھائی کے فائدے بھی ہیں اور نقصانات بھی، ہمیں چاہیے کہ ہم سمجھ داری اور ذمے داری کے ساتھ ان کا خیال کریں۔ اگر ہم باقاعدگی سے پڑھیں، توجہ دیں اور محنت کریں تو بذریعہ انٹرنیٹ تعلیم ہمارے لیے بہتر ثابت ہو سکتی ہے۔

بہترین ساتھی

نام: محمد شایان عمر۔ جماعت: ہفتم۔ درجہ: ب
شاخ: ریگولر بوائز

کتاب انسان کی بہترین ساتھی ہے۔ کتاب کو اَدب و اِحترام سے رکھنا چاہیے، کیوں کہ یہ ہمیں علم اور شعور عطا کرتی ہے اور زندگی کی اچھی باتیں سکھاتی ہے۔ کتاب ہمیں تمیز، اخلاق اور صحیح راستہ دکھاتی ہے۔

اگر ہم کتاب کو اپنا بہترین ساتھی بنالیں تو ہم ایک اچھے اور ذِمے دار اِنسان بن سکتے ہیں۔ کتاب نہ صرف ہمیں علم دیتی ہے، بل کہ ہمیں زندگی کی حقیقتوں سے بھی آگاہ کرتی ہے۔ یہ ہمارے کردار کو سنوارتی ہے اور سوچنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کتاب انسان کی بہترین ساتھی ہے، کیوں کہ یہ ہر حال میں ہماری راہ نمائی کرتی ہے اور ہمیں کام یابی کی طرف لے جاتی ہے۔

امکانات سے ایجادات تک

نام: عفان عمران۔ جماعت: ششم۔ درجہ: الف
شاخ: ریگولر بوائز

سائنس کے معنی جاننے اور سمجھنے کے ہیں۔ ایسا علم جو مشاہدے اور تجربات پر مبنی ہو، سائنس کہلاتا ہے۔ موجودہ دور کی تقریباً تمام تر ترقی سائنس ہی کی مرہونِ منت ہے۔ انسانی زندگی میں آسانیاں، سہولتیں اور نئی ایجادات سائنس کے بغیر ممکن نہیں۔

ہم سائنس کے میدان میں مختلف طریقوں سے ترقی حاصل کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلے ضروری ہے کہ اسکولوں میں سائنس کی تعلیم کو لازمی بنایا جائے اور سائنسی مضامین کو دِل چسپ اور تجرباتی انداز میں پڑھایا جائے، تاکہ طلبہ کی دل چسپی بڑھے اور اُن میں تحقیق کا شوق پیدا ہو۔ محض کتابی علم کے بجائے عملی تجربات پر توجہ دی جائے۔

تحقیق کے فروغ کے لیے سرکاری سطح پر جدید تحقیقی ادارے

قائم کیے جائیں، جہاں نوجوان سائنس دان آزادی کے ساتھ تحقیق کرسکیں۔ انھیں جدید وَسائل اور مناسب اسباب فراہم کیے جائیں، تاکہ ان صلاحیتیں نکھر کر سامنے آسکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی جامعات اور سائنس دانوں کے ساتھ اشتراک بھی کیا جائے، تاکہ جدید تحقیق اور سائنسی ترقی سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔

بیرونِ ملک تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو وطن واپس آکر اپنی خدمات انجام دینے کی ترغیب دی جائے، تاکہ وہ اپنی معلومات اور تجربے سے ملک وقوم کی ترقی میں حصہ ڈال سکیں۔ سائنس اور صنعت وحرفت کے فروغ کے لیے مناسب رقم مختص کرنا بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔

ہمارے ملک کو ماحولیاتی آلودگی، پانی کی قلت اور زَراعت میں کمی جیسے سنگین مسائل کا سامنا ہے۔ ان مسائل کے پائیدار حل کے لیے سیاسی نعروں کے بجائے سائنسی اور عملی طریقے اختیار کیے جائیں۔ مقامی مسائل کے لیے مقامی سطح پر سائنسی حل تلاش کیے جائیں، تاکہ نتائج مؤثر اور دیرپا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اَشرف المخلوقات بنایا ہے اور اِسے عقل و شعور کی نعمت عطا کی ہے۔ سائنس کی بدولت انسان غیر معمولی ترقی کرسکتا ہے۔ اگر ہم سائنس کو اچھے اور مثبت مقاصد کے لیے استعمال کریں تو یہ انسانیت کے لیے ایک عظیم نعمت ثابت ہوسکتی ہے اور دُنیا کو بہتر بنانے میں اہم کردار کرسکتی ہے۔

ہر فرد ہے......

نام: ایان کاسمانی۔ جماعت: ہفتم۔ درجہ: الف
شاخ: ریگولر بوائز

ہر انسان اپنی قوم کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے۔ فرد اور قوم کا رِشتہ لازم ملزوم ہے، کیوں کہ قوم کی ترقی اور زَوال کا مدار اُس کے افراد پر ہوتا ہے۔ اگر ایک فرد نیک، ایمان دار اور باکردار ہو تو اِس کا مثبت اثر پورے معاشرے پر پڑتا ہے اور اگر ہر فرد اپنی ذمے داری کو سمجھے تو قوم ترقی کی راہ پر گام زن ہوجاتی ہے۔

ایک اچھا شہری وہی ہوتا ہے جو اپنا کردار مثبت انداز میں ادا کرے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی ذات سے اصلاح کا آغاز کریں، کیوں کہ قوم کی اصلاح فرد کی اصلاح سے ہی ممکن ہے۔ اگر ہم سب اچھے شہری بن جائیں اور اپنی ذمے داریوں کو دِیانت داری سے نبھائیں تو ہمارا ملک بہت تیزی سے ترقی کرسکتا ہے۔

تعلیم کسی بھی قوم کی ترقی کی بنیاد ہوتی ہے۔ اگر ہم تعلیم حاصل کرکے نہ صرف زندگی سنواریں، بل کہ دوسروں کی مدد بھی کریں تو یہی حقیقی معنوں میں قوم کی خدمت ہوگی۔ ایک تعلیم یافتہ فرد ہی معاشرے کو بہتر سمت دے سکتا ہے۔

سچائی، دیانت داری اور وَقت کی قدر ایک کام یاب فرد کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ہمیں ہمیشہ سچ بولنا چاہیے اور جھوٹ سے بچنا چاہیے، کیوں کہ جھوٹ فرد اور معاشرے، دونوں کو کم زور کردیتا ہے۔ اسی طرح وقت کی پابندی بہت ضروری ہے، ہمیں اپنا وقت فضول کاموں میں ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

والدین اور اَساتذہ کا ادب کرنا بھی ہماری بنیادی ذمے داری ہے، کیوں کہ اچھی تربیت گھر اور اِسکول ہی سے شروع ہوتی ہے۔ اگر ہم بادب اور نیک سیرت ہوں گے تو یقیناً اچھے اعمال انجام دیں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں بُرے دوستوں اور بُری عادتوں سے دور رہنا چاہیے، کیوں کہ بُری صحبت انسان کے کردار کو تباہ کردیتی ہے۔

ملک وقوم سے وفاداری ہر شہری کا فرض ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے، تاکہ معاشرہ مضبوط اور خوش حال بن سکے۔

صفائی کا خیال رکھنا بھی ہماری اجتماعی ذمے داری ہے، کیوں کہ صاف ستھرا معاشرہ ہی ترقی یافتہ کہلاتا ہے۔

آخر میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ اگر ہر فرد مکمل دین پر عمل کرتے ہوئے اپنی ذمے داری کو سمجھے اور اپنے فرائض کو ایمان داری سے ادا کرے تو قوم ضرور کام یاب ہوگی، اسی لیے کہا گیا ہے:

''ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ۔''

☜ الحمدللہ مئی 2026 کا شمارہ جلد موصول ہوا۔ رسالے کی ہر کہانی بہت ہی دل چسپ، معلوماتی اور مزے دار تھی، پڑھ کر مزہ آگیا۔ ''غلط کام کا غلط انجام'' یہ کہانی بھی بہت پسند آئی۔ نظمیں اور کھیل بھی بہت دل چسپ تھے۔

(حبیبہ محمد اسامہ سرسری۔کراچی)

☆پسندیدگی کا شکریہ!

☜ ماہ نامہ ذوق شوق کے مئی کے شمارے میں ایک الگ ہی کشش ہے۔ تمام لکھاریوں نے اپنے اپنے قلم کا جوہر دکھایا ہے۔ ''سیرت کہانی'' میں ہمارے بچوں کے لیے بہترین علم چھپا ہوا ہے۔ کہانی کے ذریعے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اخلاق کو بیان کرنے کی اچھی کوشش ہے۔ محمد اکمل معروف کی ''بلاعنوان کہانی'' ایک بہترین سبق آموز کہانی ہے، اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نیکی کرتے وقت ہمیں مکمل دھیان دینا چاہیے کہ آیا کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ نیکی وہی اچھی ہوتی ہے جس میں دکھاوا نہ ہو۔ دانیال چغتائی صاحب کی کہانی ہمارے ملک کی تاریخ اور ایمان کو بیان کرتی ہے، سائرہ شاہد کے قلم سے لکھی ''پھپو کا قہر'' ایک بہترین اور نٹ کھٹ کہانی ہے، جسے پڑھ کر مزہ آیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی نزہت جبین کی کہانی ''فاسٹ فوڈ'' آج کے بچوں کے لیے بہترین سبق ہے۔ آج کے بچے جنک فوڈ کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ تازہ اور دیسی خوراک تو انھیں بھاتی ہی نہیں ہے۔ ماہ نامہ ذوق شوق کا پورا شمارہ ایک بہترین انداز میں بہترین سبق بیان کر رہا ہے۔ اس کا ہر صفحہ ایک کہانی بیان کرتا ہے۔ بچوں کو مطالعے کا عادی کرنے میں، میں ماہ نامہ ذوق شوق کی پوری ٹیم کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

(ساجدہ امیر۔راجن پور)

☆اس شکریے پر آپ کا شکریہ!

☜ مئی کا شمارہ ہاتھوں میں آتے ہی سب سے پہلے سرورق پر نظر پڑی تو بے اختیار مجھے اپنی ششم جماعت کی اردو کی کتاب کا سبق ''ہم نے کی قربانی'' یاد آگیا، جس کی تصویر بالکل ایسی ہی تھی۔ ''پیغامِ الٰہی'' کے ذریعے وقت کی قدر و قیمت اور اچھے کاموں کی اہمیت کا احساس ہوا، جب کہ ''پیغامِ نبوی'' میں آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی پر درود بھیجنے کی فضیلت نے دل کو منور کر دیا۔ ''علیک سلیک'' میں والدین کی اہمیت اور اُن کی خدمت کو جنت کے حصول کا ذریعہ بتانا انتہائی بروقت اور اہم پیغام تھا۔ ''سیرت کہانی'' ہمیشہ کی طرح بہت پُرکشش تھی اور ''بلاعنوان'' نے نیکی کو پوشیدہ رکھنے کا جو درس دیا وہ یقیناً قابلِ عمل ہے۔ ''ہماری مرضی سے کیسے؟'' کے تجربات ہمیشہ کی طرح دل چسپ رہے۔ اسی دوران میں ہمیں اپنے پھوپھا کے ذریعے ایک افسوس ناک خبر ملی کہ بروز ہفتہ عاصم بھروچہ صاحب کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند کرے اور اُن کی قبر کو جنت کا باغ بنائے۔ آمین! عاصم بھروچہ صاحب ہمارے پھوپھا کے دوست ہیں اور اُن کے محلے میں ہی رہائش پذیر ہیں۔ ''حماد کی پریشانی' اور ''غرور کا انجام''، دونوں ہی کہانیاں سبق آموز تھیں، خاص طور پر غرور کے نقصانات پر مبنی کہانی نے بہت کچھ سکھایا۔ ''انو منو کا دسترخوان'' میں بتائی گئی ترکیب بھی

بہت عمدہ تھی اور آخر میں جو سوال پوچھا گیا، اس کا جواب ''قادیانی'' ہے۔ امید ہے میرا جواب درست ہوگا، لہٰذا مجھے بھی قرعہ اندازی میں ضرور شامل کیجیے گا۔ ''الٰہی! منتظر ہوں'' ایک شان دار نظم تھی، جب کہ ''بکھرے موتی'' میں موجود باتیں واقعی اَن مول ثابت ہوئیں۔ ''ہمتِ مرداں، مددِ خدا'' کا عنوان ہی بہت حوصلہ افزا ہے اور یہ کہانی واقعی سبق آموز تھی۔ ''گم نام موجد'' میں پانچ بڑے موجدوں کے تعارف نے معلومات علم میں اضافہ کیا اور ''جھوٹوں کے جھوٹے'' کی آخری قسط پڑھ کر خوشی ہوئی کہ اس کا اختتام بہت اچھا رہا۔ ''پھپو کا قہر'' بچوں کی نفسیات کے عین مطابق ایک بہترین کہانی لگی۔ ''طیبہ دکھا'' نظم دل کو چھو گئی۔ ''فاسٹ فوڈ'' کہانی نے عازم اور رملہ کے ذریعے ہمیں یہ سمجھایا کہ پھپو کیوں باہر کے کھانے سے سختی سے منع کرتی ہیں، یہ آج کے دور کی ایک اہم ضرورت ہے۔ ''پھر کیا ہوا؟'' میں ''بے نقاب' کی کہانی میں آخر کار توفیق کے بے نقاب ہونے کا منظر دل چسپ تھا۔ ''شکر پارے'' ہمیشہ کی طرح مسکراہٹیں بکھیرتے رہے، جب کہ ''بھولو کا فن'' اور ''غلط کام کا غلط انجام'' بھی بہت معلوماتی تھیں۔ ''نئے لکھاریوں'' کی حوصلہ افزائی کا سلسلہ دیکھ کر بہت اچھا لگا، خاص طور پر ''البدر البرکہ اسکول'' کے طلبا کی کاوشیں قابلِ داد ہیں۔ ''خط جو آپ کا ملا'' میں اپنا نام دیکھ کر دِل خوشی سے بھر گیا۔ رمضان شاکر صاحب کا تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔

(محمد حمزہ اویس۔ کراچی)

☆ اللہ تعالیٰ بھائی عاصم بھروچہ صاحب کی والدہ کے آخرت کی تمام گھاٹیاں آسان فرمائے۔ آمین!

ماہ مئی کا شمارہ عید قرباں کے سرورق سے سجا ہوا ملا، مگر اِس حوالے سے کہانیاں نہیں تھیں۔ خاص کہانیوں میں ''گم نام موجد''، ''بھولو کا فن'' منفرد تھیں۔

(اہلیہ محمد یامین۔ کراچی)

☆ مئی کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ سرورق موقع محل کے لحاظ سے بنایا گیا، جو عیدالاضحی کی منظر کشی کر رہا تھا۔ ''علیک سلیک'' حسبِ معمول اچھی تھی اور سبق آموز تھی۔ ''سیرت کہانی'' بہترین سلسلہ ہے۔ ''بلاعنوان'' کہانی مزے دار لگی۔ ''حماد کی پریشانی'' اچھی لگی۔ ''انو منو کا دسترخوان'' بھی شوق سے پڑھی۔ ''ہمت مرداں، مدد خدا'' بھی بہتر تھی۔ ''گم نام موجد'' سے معلومات میں اضافہ ہوا۔ ''جھوٹوں کے جھوٹے'' بہترین سلسلہ تھا۔ ''پھپو کا قہر'' بھی اچھی تھی۔ نظمیں بھی اچھی تھیں۔ ''فاسٹ فوڈ'' نے بھی اچھا پیغام دیا۔ ''بے نقاب'' بہتر تھی۔ ''سب سے بڑی چوری'' بھی اچھی تھی۔ ''بارش کے فائدے'' بھی پسند آئے۔

(محمد عمران شمس۔ کراچی)

☆ ہمیں آپ کا خط پسند آیا!

مئی کا شمارہ جب موصول ہوا تو سرورق بقر عید کی نشان دہی کر رہا تھا۔ ''علیک سلیک'' نے والدین کی اہمیت کو اُجاگر کیا۔ ''سیرت کہانی'' اچھا سلسلہ ہے۔ ''بلاعنوان'' کہانی نے نیکی کر، دریا میں ڈال کا سبق دیا۔ ''حماد کی پریشانی''، ''غلط کام کا غلط انجام'' اچھی کہانیاں تھیں۔ ''جھوٹوں کے جھوٹے'' کا سلسلہ اختتام کو پہنچا، جو کہ ایک بہت خوب صورت سلسلہ تھا۔ ''پھر کیا ہوا!؟'' کا سلسلہ بھی بہت اچھا چل رہا ہے۔ ماہ نامہ ''ذوق وشوق'' کے لیے بہت ساری دعائیں۔ اگر میرا خط شائع ہوا تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔

(بنت صارم حسین۔ کراچی)

☆ اور ہمیں آپ کی خوشی کا سبب بن کر خوشی ہوئی!

اس دفعہ ہمیں مئی کا رسالہ جلدی مل گیا تو اس وجہ سے تبصرے کا موقع بھی مل گیا۔ سب سے پہلے تو ذوق وشوق کے ادارے کو میری طرف سے ''بقرہ عید مبارک''۔ سرورق پر نظر پڑتے ہی قربانی کے دن کی یاد آگئی۔ ''علیک سلیک'' میں مدیر کا شکریہ کہ انھوں نے ہمیں بتایا کہ ہمارے اصل خیرخواہ ہمارے ماں باپ ہیں اور ہمیں اس عظیم نعمت کی قدر کرنی چاہیے۔ ''بلاعنوان'' کہانی میں بہت اچھا سبق سیکھنے کو ملا اور ساتھ ہی اک نئی حدیث بھی پتا چلی۔ جزاک اللہ محمد اکمل معروف۔ ''حماد کی پریشانی'' میں یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر اِنسان دنیاوی خواہشات میں پیسے خرچ کرنے کے بجائے دین کے راستے میں خرچ کرے تو اِنسان جلد ترقی کرے گا۔ آخر میں بس اتنا کہ ''سال نامہ'' کا آغاز امن وامان کے ساتھ ہوا اور ذوق وشوق خوب پھلے پھولے۔ آمین!

(اروا خرم۔ کراچی)

☆ ثم آمین!

بلاعنوان (225) شمارہ مئی 2026ء کے بہترین عنوان ارسال کرنے والے تین قارئین

اول: ''بڑی بھول'' محمد عبداللہ منیب۔کراچی

دوم: ''درست طریقہ'' سلیمان عمر۔کراچی

سوم: ''خاموش نیکی'' دانیال حسن چغتائی۔کہروڑپکا

سوم والا عنوان چار قارئین نے بھیجا تھا، جن میں سے بذریعہ قرعہ اندازی ایک نام منتخب ہوا ہے۔ بقیہ تین قارئین کے نام مندرجہ ذیل ہیں: ا۔ ذروہ عامر۔کراچی۔2۔مسفرہ عبدالقدیر۔کراچی۔3۔نمرہ رانو۔ملتان۔

اچھے عنوانات ارسال کرنے والے دیگر قارئین

کراچی: ہبہ طلحہ، محمد عروہ، ذروہ عامر، محمد مصطفیٰ، حورالعین، سیدہ کلثوم، بشریٰ بنت فہد، ابراہیم عماد، سلیمان عمر، حافظ عبدالرحمٰن، بنت صارم حسین، اُنیس بن محمد سہیل، عبداللہ کھتری، محمد بن طلحہ انوار، مصطفیٰ احمد، حافظہ زینب فرحان، سنینہ ارقم، زید بن ارقم، امیمہ بنت محمد حسن، عبداللہ منیب، محمد داود بن فہد، سید محمد عرفان، حافظہ رمیسہ غفار، ام ہانی عرفان، اہلیہ محمد یامین، امان اللہ بجیر، ثناء بنت اخلاق۔**ڈگری:** ربیعہ غزالی۔**سکھر:** محمد مکی۔ **ملتان:** نمرہ رانو۔ **راول پنڈی:** انعت نور۔ **بالاکوٹ:** حفصہ مریم۔**کوہاٹ:** انعت بی بی۔

ذہنی آزمائش/وق معلومات (123) شمارہ مئی 2026ء کے تین انعام یافتہ قارئین

کراچی: ☆ذروہ عامر۔☆عمر بن محبوب۔**ملتان:** ☆نمرہ رانو۔

درست جواب ارسال کرنے والے دیگر قارئین

کراچی: محمد عویم، محمد انس، محمد عروہ، محمد طلحہ، ہانیہ حسان، عفراء بنت فہد، مریم عمر شیخ، محمد دانیال راٹھور، حافظ عبدالرحمٰن، بنت صارم حسین، اُنیس بن محمد سہیل، عبداللہ کھتری، محمد بن طلحہ انوار، مصطفیٰ احمد، محمد اسحاق صدیقی، حورالعین، حافظہ زینب فرحان، سنینہ ارقم، زید بن ارقم، امیمہ بنت حسن، یمنیٰ بنت عتیق الرحمٰن، محمد عبداللہ منیب، بنت محمد فہد، سید عمر عرفان، سید محمد ابوبکر، زینب بنت عمرو، احنف بن عاطف، حافظہ رمیسہ غفار، ام ہانی عرفان، اہلیہ محمد یامین، امان اللہ بجیر، مسفرہ عبدالقدیر، ثناء بنت اخلاق۔ **ملتان:** محمد کاشف۔ **کہروڑ پکا:** دانیال حسن۔ **راول پنڈی:** شفق نور۔ **منڈی بہاؤالدین:** محمد اول۔ **ہنگو:** عبدالوحید۔ **کوہاٹ:** صاحبہ بی بی۔

سوال آدھا جواب آدھا (79) شمارہ مئی 2026ء کے تین انعام یافتہ قارئین

کراچی: ☆مسفرہ عبدالقدیر۔☆ام ہانی عرفان۔☆مصطفیٰ احمد۔

درست جوابات ارسال کرنے والے دیگر قارئین

کراچی: محمد عروہ، ذروہ عامر، حافظ عبدالرحمٰن، بنت صارم حسین، اُنیس بن محمد سہیل، عبداللہ کھتری، محمد بن طلحہ انوار، حورالعین، عبداللہ منیب، حافظہ رمیسہ غفار، امان اللہ بجیر۔ **کہروڑ پکا:** دانیال حسن۔ **راول پنڈی:** ملک شاہ زیب احمد۔ **کوہاٹ:** ودان احمد۔

ماچس کی تیلیاں مئی 2026ء کے تین انعام یافتہ قارئین

کراچی: ☆نوفل بن اسماعیل۔

درست جواب ارسال کرنے والے دیگر قارئین

کراچی: محمد عویم، محمد انس، ہبہ طلحہ، محمد عروہ، عبدالہادی، محمد احمد، زینب کاشف، ذروہ عامر، ریان بن نوشاد، حمنہ دانش، عبدالمنان، سیدہ کلثوم، ارقم بن نعیم، ہانیہ حسان، بلال اسد، عفراء بنت فہد، سلیمان عمر، حافظ عبدالرحمٰن، بنت صارم حسین، اُنیس بن محمد سہیل، عبداللہ کھتری، محمد بن طلحہ انوار، مصطفیٰ احمد، عائشہ محمد حسین، حورالعین، حافظہ زینب فرحان، سنینہ ارقم، زید بن ارقم، عبداللہ منیب، ہارون فہد، سید محمد عمر، نوفل بن اسماعیل، زینب بنت عمرو، حافظہ رمیسہ غفار، ام ہانی عرفان، محمد صفان، مسفرہ عبدالقدیر، ثناء بنت اخلاق۔

کوپن برائے
بلاعنوان 227

نام: ____________ ولدیت: ____________

مکمل پتا: ____________

فون نمبر: ____________

کوپن برائے
ذوقِ معلومات 125

نام: ____________ ولدیت: ____________

مکمل پتا: ____________

فون نمبر: ____________

کوپن برائے
سوال آدھا جواب آدھا 81

نام: ____________ ولدیت: ____________

مکمل پتا: ____________

فون نمبر: ____________

کوپن برائے
گھومتا مکعب

نام: ____________ ولدیت: ____________

مکمل پتا: ____________

فون نمبر: ____________

ہدایات: ☆ جوابات 31 جولائی 2026ء تک ہمیں موصول ہوجانے چاہییں...... ☆ ایک کوپن ایک ہی ساتھی کی طرف سے قبول کیا جائے گا......

☆ کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا جس پر اعتراض قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ مقررہ تاریخ کے بعد موصول ہونے والے جوابات قرعہ اندازی میں شامل نہیں کیے جائیں گے۔

☆ کوپن کو قلم سے پُر کر کے اور جواب صاف کاغذ پر لکھ کر واضح تصویر کھینچ کر اِس نمبر (0300-2229899) پر واٹس ایپ بھی کر سکتے ہیں۔

جولائی 2026 کے کوپن کے نام ستمبر 2026 کے شمارے میں شائع ہوں گے، ان شاء اللہ

بچیوں کی دل چسپی اور
تربیت کے لیے بہترین تحفہ
پیاری بیٹی
قرآن وسنت کے مطابق بچیوں کی بنیادی تربیت پر مشتمل
بچیوں کو اچھی عادات اور اخلاق سکھانے میں معاون
کہانیوں کی شکل میں جماعت وار، تصویری مناظر کے ساتھ
خوب صورت سلسلہ
اب ہم مکتب جائیں گی
ہم بات کریں گی آہستہ
NEW
ARRIVAL
SHOP NOW
بیتُ العلم (الوقف)
0309 2228089
www.mbi.com.pk

Registered NO. M. C. 1241 ذوق شوق